جلد ۷۲ جنوری ۱۹۷۰ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مغربی پاکستان
فی پرچہ ۷۵ پیسے

مشرقی پاکستان
فی پرچہ ۸۵ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۲	جنوری ۱۹۷۰ء مطابق شوال المکرم ۱۳۸۹ھ	عدد ۵

مغربی پاکستان	ماہنامہ	مشرقی پاکستان
چندہ سالانہ : سات روپے	ترجمان القرآن	ہوائی ڈاک سے : ۸٫۵۰ روپے
فی پرچہ : ۷۵ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	فی پرچہ : ۸۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اب جبکہ حکومت کی طرف سے ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندی اٹھا دی گئی ہے تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ملک کے سارے بہی خواہوں اور سوچنے سمجھنے والے افراد کی خدمت میں ان سرگرمیوں کی نوعیت، ان کے جائز حدود اور ان کے مقصد و منہاج کے بارے میں چند گزارشات پیش کریں اور تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلائیں، تاکہ وہ صورتِ حال کی نزاکت کو سامنے رکھ کر کوئی اقدام کریں۔

صدیوں کے غلط رجحانات اور اخلاقی انحطاط کی وجہ سے سیاست کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ لازمی طور پر چالاکی، عیاری، مکر و فریب اور زیر دست آزاری کا کوئی مکروہ کاروبار ہے جس سے ہر شریف انسان کو دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ خصوصاً عملی سیاست سے تو اسے ہمیشہ دست کش ہی رہنا چاہیے، کیونکہ جو بھی اس میں ملوّث ہو گیا اس کے دین، ایمان، اور اخلاق کی خیر نہیں۔ اس نظریے کو دنیا پرستوں اور اقتدار کے بھوکوں اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں نے بڑی ہنر مندی کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں میں اُتارا ہے۔ سیاست کے بارے میں اس نوعیت کے "پند و نصائح" قومی اور ملکی سطح پر بھی کیے جاتے ہیں اور محدود پیمانے پر محلوں اور گلیوں میں بھی ان کا پرچار کیا جاتا ہے۔ جس طرح کسی محلے کا آوارہ اور اوباش آدمی کبھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ظلم و ستم کی کارروائیوں پر کوئی شریف آدمی حرف گیری کرے یا عملاً

اس کے راستے میں مزاحم ہو، بالکل اسی طرح قومی سطح پر خود غرض اور ظالم لوگ کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی مخلص اور خلقِ خدا سے سچی اور بے لوث محبت رکھنے والا ان کی چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرے اور مظلوم اور بے بس انسانیت کو ان کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے عملی جدوجہد کرے۔ ہم میں سے ہر شخص کے روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ محلے کے ظالم افراد اُس عابد و زاہد کی بڑی تکریم کرتے ہیں جو ظلم کا خاموش تماشائی بلکہ اس سے بالکل بے تعلق ہو کر رہے۔ ظاہری طور پر ایسے شخص کا بڑا احترام کیا جاتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کچھ اس انداز سے کی جاتی ہے کہ یہ صاحب بڑے خدا ترس بزرگ ہیں، انہوں نے دنیا اور اس کے معاملات سے منہ موڑ لیا ہے۔ اس قسم کے بزرگ کی خدا ترسی سے ان کی مُراد یہ ہوتی ہے کہ انسانوں سے اس کا کوئی ربط ضبط باقی نہیں رہا، اور "دنیا سے منہ موڑنے" کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہوتا ہے کہ اس نے ان ظالموں کی ستم رانیوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور انہیں اس بات کی کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں لوگوں کو ستائیں اور ان کے حقوق پر ڈاکہ ڈالیں۔ اسے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں۔

کسی ظالم اور ستم کش کے لیے اس سے زیادہ کوئی بات ناقابلِ برداشت نہیں ہو سکتی کہ کوئی پاکیزہ زبان اس کی کرتوتوں پر نفرین بھیجے اور کوئی نیک ہاتھ اسے ظلم سے باز رکھنے کے لیے آگے بڑھے۔ ہر بُرا آدمی دوسرے بُرے آدمی کی تنقید تو گوارا کر لیتا ہے اور اپنے معاملات میں اس کی دخل اندازی کو بھی طوعاً و کرہاً برداشت کر لیتا ہے، مگر اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں ہوتی کہ بھلے آدمیوں اور نیک اور خدا ترس افراد کی طرف سے اس پر گرفت ہو اور عملاً اس کی بداعمالیوں کی مزاحمت کی جائے۔ ظالموں کے اس طرزِ عمل کے بہت سے اسباب ہیں مگر اس کا بنیادی سبب ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ایک ظالم کو اگر دوسرا ظالم ٹوکتا ہے یا اس کا راستہ روکتا ہے تو اس صورت میں تسلط اور بالادستی بہرحال ظلم ہی کی قائم رہتی ہے اور ظالموں کی چودھراہٹ پر کوئی آنچ نہیں آنے پاتی۔ یہ صورتِ حال ظالموں اور ستم کشوں کے لیے کسی جہت سے بھی تشویشناک نہیں

وہ ظلم کی بادشاہت میں بڑی آسانی کے ساتھ اخلاق سوز حرکات کرتے ہیں۔ فرق صرف اس قدر پڑتا ہے کہ ایک وقت میں ظالموں کا ایک ٹولہ غلبہ حاصل کرتا ہے اور دوسرے وقت میں کسی دوسرے ٹولے کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ عوام بہرحال ظلم کے اندھیروں میں ہی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے دل و دماغ حق و انصاف کی ضیا پاشیوں سے منور نہیں ہونے پاتے۔ اس بنا پر دنیا کا ہر ظالم فرد یا گروہ یا برسرِ اقتدار طبقہ دوسرے ظالموں کی کارروائیوں کو کسی حد تک برداشت کرتا ہے، کیونکہ اسے اس امر کا پورا طرح احساس ہوتا ہے کہ اس کی شکست سے ظلم کی حکمرانی کو تو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ اگر وہ وقتی طور پر ایک غیر مؤثر قوت بن بھی گیا ہے تو کوئی ہرج نہیں۔ حالات میں تغیر کے ساتھ وہ پھر اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرے گا اور وقتی طور پر جو زک اسے پہنچی ہے اس کی کسر کسی اور وقت نکل جائے گی۔

ظالم اگر فی الحقیقت کسی چیز کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے تو وہ نیکی، شرافت، پاکبازی، خدا ترسی اور حق و صداقت کی بالادستی ہے۔ اگر یہ ساری صفات صرف کتابوں کی زینت یا وعظ و تلقین کے عنوان بنی رہیں یا چند افراد خاموشی کے ساتھ انہیں اپنے سینے سے لگائے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے رہیں تو ظالم و جابر اور مستبد گروہ اس صورتِ حال کو اپنے لیے بڑا اطمینان بخش سمجھتے ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی تعرض نہیں کرتے۔ وہ اِن صفات کو اپنے لیے خطرے کا الارم اس وقت محسوس کرتے ہیں جب کوئی فرد یا گروہ آگے بڑھ کر عملاً انہی اوصاف کی سیادت و برتری قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس وقت ظلم و استبداد کے سارے لشکر، خدا کے سرکشوں اور باغیوں کی ساری افواج مجتمع ہو کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں کیونکہ وہ اس خطرہ کو بھانپ لیتی ہیں کہ اگر ظلم کی جگہ انصاف، بے حیائی اور زبردست آزادی کی جگہ شرافت اور عدل، سیاسی معاشی اور معاشرتی دھڑے بندیوں کی جگہ حق پسندی، اور مکر و فریب کی جگہ دیانت داری اور اخلاص کی حکمرانی قائم ہو گئی تو پھر ان کے لیے اپنے ناجائز کاروبار چلانے اور ناجائز مراعات حاصل کرنے

اور لوگوں کو ستانے کے کوئی امکانات باقی نہ رہیں گے۔ اس کے علاوہ جب ستم زدہ عوام ایک مرتبہ حق و انصاف کی عملداری سے لذت آشنا ہو جائیں گے اور وہ اس عظیم فرق کو اچھی طرح محسوس کرلیں گے جو باطل کی تاریکیوں اور حق پرستی کی ضیا پاشیوں میں پایا جاتا ہے، تو پھر ظالموں کے لیے دوبارہ باطل کی حکومت قائم کرنے میں بڑی دشواری پیش آئے گی۔ کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ نیکی اور خدا ترسی کی بالادستی میں چند سال پورے اطمینان سے گزار لیتا ہے وہ پھر باطل کی حکمرانی کے عذاب کو بڑی مشکل ہی سے برداشت کرسکتا ہے۔

کفر و الحاد اور ظلم و استبداد کا نیکی و حق پرستی اور خدا ترسی کے بارے میں یہ رویہ اور احساس کوئی ایسی چیز نہیں جسے سمجھنے میں کوئی خاص دقت پیش آئے۔ آپ اسلام اور اسلامی حکومت کے بارے میں خالص علمی انداز پر جس قدر تحقیقی کام کرنا چاہیں کریں، برسرِ اقتدار طبقے اور دوسری باطل قوتیں آپ کی راہ میں قطعاً مزاحم نہ ہوں گی، بلکہ اس کارِ خیر میں آپ کی کسی حد تک معاونت و دستگیری بھی کریں گی۔ آپ جلسوں اور خطبوں میں عوام کو نیکی کی تلقین کریں تو اسے بھی باطل قوتیں برداشت کریں گی۔ آپ اپنی انفرادی زندگی میں تقویٰ اور پرہیزگاری اور ایمانداری کی تصویر پیش کریں۔ مگر باطل کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہوں تو آپ کے اس طرزِ عمل کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ البتہ سارے باطل گروہ نیکی اور خدا ترسی کے خلاف اس وقت مشتعل ہو کر صف آرا ہو جائیں گے جب آپ عملاً اس کی بالادستی قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور اس امر کے لیے کوشاں ہوں کہ اجتماعی زندگی کی زمامِ کار فساق و فجار اور خدا کے باغیوں کے ہاتھ سے نکل کر خدا کے نیک بندوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے۔ نیکی اور خدا ترسی جب تک کسی معاشرے میں غیر مؤثر قوت بن کر رہے اس وقت تک تو اسے برداشت کیا جا سکتا ہے مگر جب یہ نیکی بُرائی کا تسلط توڑنے اور خدا پرستی اور حق و انصاف کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے آگے بڑھے تو اس صورت میں باطل کے علم برداروں کی نظر میں اس سے زیادہ ناپسندیدہ اور شر انگیز چیز کوئی نہیں ہوتی اور یہ "سیاست بازی"، "اقتدار کی بھوک" اور "مذہب کا لبادہ" بن جاتی ہے۔ دوسرے

لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر نیکی بے اثر، مغلوب اور بے تعلق رہے تو یہ قابلِ قدر ہے مگر جب یہ باطل کا اقتدار ختم کرنے اور حق کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو یہ" دنیاداری" اور" سیاست کا بیکار اور غیر اخلاقی دھندا" ہے۔

اس طرز فکر کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ اجتماعی امور کو ایک خاص نہج پر ڈھالنے اور ایک خاص انداز پر چلانے کا کام دنیا پرستوں کے ہاتھ ہی میں رہنا چاہیے، اور با اخلاق، نیک اور خدا ترس لوگوں کو اس میں قطعاً دخیل نہ ہونا چاہیے، تاکہ یہ ظالم جس طرح چاہیں بے بس عوام کے سینے پر مونگ دلتے رہیں اور کوئی ان سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔

عملی سیاست کے خلاف یہ نفرت اور حقارت اور اخلاق اور دیانت سے اس کے بعید ہونے کا یہ تصور دراصل ظالموں اور ستم گروں کی ایک چالبازی ہے جس کے ذریعے نیکی اور بھلائی کی حکمرانی قائم کرنے میں مزاحمت کی جاتی ہے۔ ان لوگوں کی منطق کتنی عجیب و غریب ہے کہ اگر خدا کے باغی اور اخلاق و دیانت سے عاری لوگ بے بس مخلوق کو ستائیں، اسے اس کے بنیادی حقوق سے محروم کریں اور اس کی گردن پر خدا بن کر مسلط ہوں تو پھر یہ سیاست بالکل جائز اور درست ہے۔ لیکن اگر خدا ترس اور نیک افراد خدا ترسی اور نیکی کی عملداری قائم کرنے کے لیے سرگرم عمل ہوں تو پھر یہ ناپسندیدہ "سیاست بازی" ہے۔ سیاست کو دینی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے جو ایک مذموم کاروبار سمجھ لیا گیا ہے اس کے پیچھے ظالموں کا یہ ناپاک مقصد کارفرما ہے کہ نیکی اور خدا ترسی ایک طرف دبک کر بیٹھی رہے اور بدی کا دیو خدا کی زمین پر ننگا ناچ ناچتا رہے۔

سیاست اپنی حقیقت کے اعتبار سے حیاتِ انسانی کا کوئی ناپاک شعبہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنے مقصد و منہاج کے لحاظ سے وہی حیثیت رکھتا ہے جو خود انسانی زندگی کی حیثیت ہے۔ جس طرح انسانی زندگی بجائے خود ناپاک نہیں ہے بلکہ ایک خود غرض انسان اپنی زندگی کو خودغرضی

کا نمونہ اور ایک بے نفس انسان اسے ایثار کا پیکر بنا سکتا ہے، بالکل اسی طرح عیار اور چالاک افراد اور گروہ سیاست کو مکر و فریب کا کاروبار، اور خدا ترس اور پاکباز افراد اور گروہ اسے خدا کی رضا اور خلق کی خدمت کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ سیاست بجائے خود اپنی فطرت کے اعتبار سے دھوکہ اور چالبازی کا فن نہیں بلکہ اجتماعی زندگی کی ترتیب و تشکیل اور اسے ایک خاص راہ پر چلانے کا انداز اور نظم ہے۔ اس کے متعدد شعبے ہیں جن میں بنیادی طور پر کوئی خرابی نہیں پائی جاتی۔ جس طرح ایک باشعور فرد سب سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور پھر اس مقصد کو سامنے رکھ کر وہ اپنی زندگی کے لیے ضابطے مرتب کرتا ہے اور ان کے مطابق اپنے اخلاق و اطوار کو سنوارتا اور وسائل جمع کر کے مقصد کے حصول کی خاطر آگے بڑھتا ہے، اُسی طرح دنیا کی ہر ذی شعور قوم سب سے پہلے اس امر کا تعین کرتی ہے کہ اسے آخر کن مقاصد کے لیے زندہ رہنا ہے اور اپنی اجتماعی زندگی کو کیا رنگ دینا ہے۔ انہی مقاصد کی روشنی میں وہ اپنے لیے آئین اور دستور کو ترتیب دیتی ہے اور اس کے مطابق افراد کی سیرت اور قوم کے کردار کو ڈھالتی ہے۔ پھر اپنے قومی کردار کی اس پونجی اور مادی وسائل کی قوت کے بل بوتے پر منزل مقصود کی طرف گامزن ہوتی ہے۔

سیاست کا کام آخر اس کے سوا اور کیا ہے کہ اجتماعی زندگی کی شیرازہ بندی کرے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ شیرازہ بندی بعض مقاصد کے تحت اور بعض تدابیر کو اختیار کرنے ہی سے کی جاتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد اور ان تدابیر کو اختیار کرنے کے لیے اقدام ہی عملی سیاست ہے۔ اگر ایک فرد مقاصد کا تعین کیے بغیر اور اپنی زندگی کو کسی اصول اور ضابطے کا پابند بنائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو آخر ایک قوم کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کوئی مقصد متعین کیے بغیر، اور اپنے لیے کوئی آئین و دستور بنائے بغیر سفر حیات کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ جو لوگ "سیاست" کو ایک مذموم دھندا کہہ کر دیندار افراد اور طبقوں کو اس سے کنارہ کش رہنے کا مشورہ دیتے ہیں ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دیندار طبقوں کی طرف سے ان کے ناپاک عزائم کی مزاحمت نہ کی جائے تاکہ وہ قومی

زندگی کی شیرازہ بندی اپنے مقاصد کے مطابق کرنے اور ملک کے آئین و نظام کو اپنی خواہشات کے مطابق ترتیب دینے کے لیے آزاد رہیں۔

اسلام میں جس طرح تجارت اور صنعت و حرفت اور سارے کاروبار عبادت قرار پاتے ہیں جبکہ انہیں احکامِ خداوندی کے تحت سر انجام دیا جاتے، بالکل اسی طرح سیاست، یا دوسرے لفظوں میں اجتماعی زندگی کی ترتیب و تشکیل کا کام بھی عبادت بن جاتا ہے، اگر اسے رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اور خالق کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق سر انجام دیا جائے۔ یہ بات بالکل بعید از قیاس بلکہ یکسر خلافِ عقل ہے کہ وہ دین جس نے رہبانیت کو انسان کا اپنا خود ساختہ اور غلط طرزِ عمل تبلایا ہے، جو انسان کی پوری زندگی کو خدا پرستی کی بنیادوں پر اُستوار کرنے کا علمبردار ہے، جس نے اگر ایک طرف انسان کو انفرادی اصلاح اور تزکیۂ نفس کے اصول دیئے ہیں تو دوسری طرف اس کی اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کے لیے بھی جامع اور متوازن ضابطے تجویز کیے ہیں، وہ سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دے کر خدا کے پاکباز بندوں کو اس سے کنارہ کشی کی تلقین کرے تاکہ خدا کے باغی جس طرح چاہیں، آزادی کے ساتھ دنیا میں گمراہی اور فسق و فجور پھیلاتے رہیں اور خدا ترس افراد یہ سب کچھ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہیں۔ اجتماعی زندگی کی تشکیل میں سیاست انتہائی فیصلہ کن حیثیت سے اثر انداز ہوتی ہے اور سیاست کے ایوانوں ہی میں اس امر کے فیصلے کیے جاتے ہیں کہ قوم کو کن مقاصد کی تکمیل اور کس نوعیت کے اخلاقی ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔ اس بنا پر دنیا کا کوئی فرد یا گروہ جو کچھ بھی شعور و احساس رکھتا ہے، جسے اپنی قوم سے کچھ بھی محبت ہے وہ سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔

سیاست سے کنارہ کشی کا مشورہ دینے والوں میں جہاں چالاک اور عیار لوگ ملتے ہیں وہاں بعض خدا ترس اور نیک افراد بھی پائے جاتے ہیں جو بڑی سادگی سے یہ کہتے ہیں کہ تم افراد کو نیک بنانے کی کوشش کرو، نظمِ اجتماعی خود بخود درست ہو جائے گا۔ اس دلیل میں بعض لوگ بڑا وزن محسوس

کرتے ہیں۔ مگر اس دنیا میں اس سے بڑی سادہ لوحی اور اجتماعی معاملات سے عدمِ واقفیت کی کوئی دوسری مثال نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کا نظمِ اجتماعی بالکل ایک غیر مؤثر قوت ہے۔ وہ افراد کو بنانے اور بگاڑنے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔ افراد نیک بننے اور دوسروں کو نیک بنانے میں بالکل آزاد ہیں اور اس کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور حکومت کوئی ایسی چیز ہے کہ جب افراد نیک بن جائیں تو کسی جدوجہد کے بغیر وہ آپ سے آپ درست ہو جایا کرتی ہے۔ معلوم نہیں یہ لوگ کس طرح اس نوعیت کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئے۔

ان پاکباز افراد کا یہ نظریہ جن تین مفروضات پر قائم ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی دُرست نہیں۔ کسی قوم کی ہیئتِ حاکمہ کبھی ایسی غیر مؤثر اور غیر جانبدار قوت نہیں ہوتی کہ وہ خود بخود بغیر کسی مزاحمت کے افراد کے عزائم اور امنگوں کے مطابق ڈھلتی چلی جائے۔ حکومت کا ادارہ اجتماعی زندگی کی صورت گری کرتا ہے وہ بڑا با اختیار اور بڑی قوت کا مالک ہوتا ہے اور وہ افراد کی طرف سے لائی ہوئی ذہنی اور فکری تبدیلیوں کو خاموشی کے ساتھ قبول کرنے کے بجائے ان پر پوری شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے اور عوام کو اپنے دل پسند افکار و نظریات کا تابع بناتا ہے۔ تاریخ کے کسی دَور میں ہیئتِ حاکمہ بے وزن قوت نہیں رہی ہے۔ الناس علی دینِ ملوکھم ایک ہمہ گیر صداقت ہے جس پر انسان کی پُوری معاشرتی، سیاسی اور معاشی زندگی گواہ ہے۔ ماضی بعید میں جب حکومت کا دائرہ بالکل محدود تھا اور اس کا کام صرف کسی ملک اور قوم کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانا اور داخلی طور پر اس کے اندر امن و امان قائم کرنا تھا، اس وقت بھی اس میں بڑی قوت اور اثر آفرینی تھی۔ محلات میں جنم لینے والے افکار و نظریات، رسوم و عادات اور خوب و ناخوب کے معیارات عوام کے اندر خود بخود سرایت کرتے چلے جاتے تھے اور عام آبادی شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں اپنانے کی کوشش کرتی تھی۔ جو لوگ حکومت کی اصلاح کو افراد کی اصلاح کا بالکل منطقی نتیجہ سمجھتے ہیں ان کے اس استدلال کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر تاریخ میں پاکباز اور خدا ترس افراد اور جابر حکمرانوں کے درمیان آویزش کا کوئی نام و نشان نہ ملنا چاہیے۔ کیونکہ اصلاح کی جو لہریں افراد کے قلب و دماغ کی

تطہیر کی ذمہ دار تھیں وہ لازمی طور پر بغیر کسی رکاوٹ کے آگے بڑھ کر اقتدار کے ایوانوں کو بھی تمام آلائشوں سے پاک کر دیتیں۔ پھر اس راہ میں مزاحمت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہونا چاہیے تھا۔ مگر تاریخ کے صفحات بالکل اس کے برعکس شہادت پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جب بھی اصلاح کی کوئی تحریک شروع ہوئی تو حکمرانوں نے خاموشی کے ساتھ اس کے اثرات قبول کرنے کے بجائے اسے دبانے اور ختم کرنے کے لیے کوئی تدبیر استعمال کرنے میں دریغ نہ کیا اور اس بات پر پورا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دکھایا کہ عوام کسی طرح اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں بلکہ ان کی غلامی ہی گرفتار رہ کر زندگی بسر کریں۔ دنیا کی آخر کسی ایسی دینی اور اصلاحی تحریک کی نشاندہی کیجیے جو ظالموں اور ستم کشوں کی حکمرانی کو انصاف اور خداترسی سے بدلنے کا عزم لیکر اٹھی ہو اور حکومت کے ایوانوں میں اس کا خیر مقدم کیا گیا ہو اور برسرِ اقتدار طبقے محض تلقین و ترغیب سے خود بخود درست ہو گئے ہوں۔ انسان کی پوری تاریخ اس قسم کی خوش فہمیوں سے خالی ہے۔ ماضی میں تو ریاست حاکمہ کا دائرۂ کار بالکل محدود تھا۔ ذرائع حمل و نقل بھی اتنے دشوار تھے کہ کوئی حکومت کوشش کے باوجود اپنی ساری رعایا کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھنے سے قاصر تھی۔ حکومت کے کارناموں کو اچھالنے اور اس کے افکار و نظریات کو پھیلانے کے لیے نشر و اشاعت کی وہ سہولتیں بھی میسر نہ تھیں جو آج ہیں۔ اُس وقت اگر وہ اصلاح کی راہ کا سنگِ گراں ثابت ہو سکتی تھی تو آج جبکہ اس کا دائرۂ کار پوری زندگی پر محیط ہے، اس کی قوت و طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے، اس کی وسیع پراپیگنڈہ مشینری لوگوں کے ذہنوں کو ماؤف کرنے کی غیر معمولی قوت رکھتی ہے، اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ افراد کی اصلاح سے وہ خود بخود درست ہو جائے گی انتہائی سادگی ہے۔

پھر اس انداز پر سوچنے والے حضرات اس حقیقت سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں کہ پہلے بادشاہ اور حکمران زندگی کے بارے میں اپنے کوئی لگے بندھے افکار و نظریات نہ رکھتے تھے۔ ان کا مقصد صرف اسی قدر ہوتا تھا کہ کسی طرح وہ عوام کی گردنوں پر مسلط رہیں اور ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر دادِ عیش دیتے رہیں۔ ان کو غرض صرف اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے سے تھی۔ اس بنا پر جب اصلاح کی کوئی تحریک نمودار ہوتی تو وہ یہ دیکھتے تھے کہ کیا اس کا رُخ براہِ راست ان کی مسندِ اقتدار کی طرف

تو نہیں ہے، اور اس جائزہ کے بعد اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ ان کی مسند ابھی اس کی زد سے محفوظ ہے تو وہ اُسے کچھ وقت کے لیے گوارا بھی کر لیتے تھے۔ اس وقفے میں مصلحین کو کام کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ مگر آج صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے۔ آج اقتدار کے تخت پر متمکن ہونے والے افراد اور گروہ اپنے دل پسند افکار و نظریات کے علمبردار کی حیثیت سے اقتدار پر قابض ہوتے ہیں اور پھر اپنے ان افکار و نظریات کو نہ صرف حکومت کے وسائل کی مدد سے پھیلاتے ہیں بلکہ ان کی بنیاد پر پوری اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ہر اُس اصلاحی تحریک کو اوّل روز ہی سے حکومت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کے تصورات برسرِ اقتدار طبقے کے نظریات سے کچھ بھی مختلف ہوں۔ آج کی حکومتیں عوامی تحریکات کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس ہوتی ہیں اور وہ ایک ثانیہ کے لیے بھی ان تحریکوں کو برداشت نہیں کرتیں جو اُن کے نظریات کے خلاف کوئی دوسرے نظریات اور ان کے پیش کردہ اخلاقی معیارات کے برعکس کوئی دوسرے اخلاقی معیارات پیش کرنے کا عزم رکھتی ہوں۔ اگر کچھ وقت کے لیے انہیں برداشت کیا جاتا ہے تو اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے وجود سے کسی ملک یا قوم کی اجتماعی زندگی میں تبدیلی پیدا ہونے کا خطرہ پیدا نہ ہو۔ دوسرے ان کی سرگرمیوں سے کسی دوسری زیادہ فعّال اصلاحی تحریک کی قوت توڑنے میں برسرِ اقتدار طبقہ کو مدد ملنے کے امکانات ہوں۔

دنیا کا ہر حکمران گروہ مخالف تحریکات کو ناکام بنانے میں بڑی چابکدستی سے مختلف چالیں چلتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی چالبازی یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ نظریاتی اور فکری اعتبار سے باہم متفق ہوں اور ایک ہی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے کا عزم رکھتے ہوں اُن کے اندر مختلف طریقوں سے انتشار پیدا کر کے انہیں آپس میں لڑا دیا جاتا ہے تاکہ ان کی قوتیں آپس کی سر پھٹول میں ضائع ہو جائیں اور برسرِ اقتدار طبقے کے خلاف استعمال نہ ہونے پائیں۔

ان مقدس افراد کا "عوام کی اصلاح سے حکومت کی اصلاح" کا نظریہ جس دوسرے مفروضے پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ افراد اپنی اور دوسروں کی اصلاح کر لینے میں بالکل آزاد اور اس پر پوری طرح قادر ہیں۔ یہ نظریہ بھی خلافِ واقعہ ہے کچھ لوگ ذکر و فکر کی محفلیں آراستہ کرنے کو مذہبی آزادی خیال کرتے ہیں تو یہ اُن کی بڑی خوش فہمی ہے۔ دَورِ جدید کے حکمران اتنے بیوقوف اور غبی نہیں ہیں کہ وہ کسی آرڈی ننس کے ذریعہ ان محفلوں پر کوئی پابندی عائد کر دیں۔ اس نوعیت کی سرگرمیوں سے وہ براہِ راست کبھی تعرض نہیں کرتے۔ البتہ ان محفلوں کے گردوپیش کی دنیا میں ایسا روح فرسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں کہ بالآخر یہ محفلیں خود بخود سونی پڑ جاتی ہیں۔ ذرا سوچیے، آخر کیا وجہ ہے کہ بڑے دیندار اور نیک گھرانوں کے اندر پیدا ہونے والی اور نیک اور پاکیزہ فضا کے اندر پلنے والی اولاد میں سے آج خدا کے باغی اور سرکش نوجوان نکل رہے ہیں؟ بعض لوگ اس المیہ کو بخت و اتفاق پر محمول کر کے اجتماعی ماحول کی غیر معمولی قوت اور اثر آفرینی کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ محض فریبِ نفس ہے۔ اس المیہ کی سب سے بڑی وجہ ایک ہی ہے کہ آج بچہ اپنے گردوپیش جو ماحول پھیلا ہوا پاتا ہے وہ دینی افکار اور اخلاقی احساسات کے لیے سخت زہر آلودہ ہے اور ماں باپ بچے کو اس سے جتنا بھی بچا کر رکھیں وہ اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے خطرناک جراثیم لازمی طور پر اس میں سرایت کر کے اس کے اندر کفر و الحاد اور فسق کا زہر بھر دیتے ہیں۔ وہ اگر بعض مصالح کی بنا پر علانیہ طور پر اس کا اظہار نہ بھی کرے تو بھی اس کے سوچنے سمجھنے کے انداز، اس کی معاشرت اور اس کی عادات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اسے دین کے بجائے کفر عزیز ہے۔ پاکستان کے گذشتہ بائیس سال کے حالات پر نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ آیا اس مدت میں اسلامی تعلیمات کو فروغ حاصل ہوا ہے یا کفر اور الحاد کو شہ ملی ہے۔ حالانکہ ذکر و فکر کی محفلوں پر حکومت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی۔ پھر عقل یہ ماننے پر بھی کبھی تیار نہیں ہو سکتی کہ انسان فطری طور پر خدا سے بغاوت، دین سے بیزاری اور اخلاقی اقدار سے انحراف کی طرف مائل ہے۔ شیطان کی قوت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر شیطان اپنی قوت انسان کے

اندرونی احساسات سے زیادہ خارجی ماحول سے حاصل کرتا ہے کیونکہ خدا نے انسان کو فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بھلائی کے جذبات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اگر خدا سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتا ہے تو اس میں اس کی فطرت کا دخل نہیں ہوتا بلکہ اس غلط ماحول کا اثر ہوتا ہے جو اس کی صالح اور نیک فطرت کو مسخ کر دیتا ہے۔ اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کو سیاست بازی کہہ کر نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھنا خدا کے بندوں کو فریب دینا ہے۔

کسی لادینی حکومت میں مذہبی آزادی کا بھرم اُسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک مذہبی اور دینی سرگرمیاں اعتقادی مسائل کی محض تشریح و توضیح تک محدود رہیں۔ مگر جس لمحہ ان سرگرمیوں سے یہ مترشح ہونے لگتا ہے کہ ان کا مقصد اجتماعی زندگی کو نیکی اور خدا ترسی کی بنیاد پر اُستوار کرنا ہے تو اسی وقت ان کی روک تھام شروع کر دی جاتی ہے۔ مثلاً آپ پردہ کے بارے میں جس قدر چاہیں وعظ کرتے پھریں کوئی آپ سے باز پرس کرنے والا نہ ہوگا لیکن اگر آپ اُن محرکات، اُن اداروں اور اُن قوانین اور ضابطوں میں تبدیلی لانا چاہیں جن سے بے پردگی اور فحاشی پھیلتی ہے تو اس کی آپ کو قطعاً اجازت نہ دی جائے گی اور آپ کو اس دینی فرض کی انجام دہی سے پوری قوت کے ساتھ روک دیا جائے گا۔

جس انداز سے آج تاریخ مرتب کی جاتی ہے اس سے یہی تاثر ملتا ہے کہ پہلے حکمران بڑے سفاک اور جابر تھے اور اُن کے مقابلے میں آج کے حکمران بڑے انصاف پسند اور وسیع الظرف ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو صورتِ حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ جس قدر جبر و استبداد کا مظاہرہ دورِ حاضر کی حکومتیں کر رہی ہیں اس کا عشرِ عشیر بھی ماضی کے حکمرانوں میں نہیں ملتا۔ اُن کا جبر زیادہ تر اس نوعیت کا ہوتا تھا کہ کسی سرکش کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا، یا عوام سے بعض ناجائز ٹیکس وصول کر لیے، یا کسی کی زمین اور مکان چھین لیے۔ مگر ان میں یہ قوت قطعاً نہ تھی کہ

ایک پوری کی پوری قوم کو اس کی مرضی کے علی الرغم عملاً باطل کا پرستار بنا دیں اور اُسے محسوس تک نہ ہونے دیں۔ کیا آج نظریاتی اختلاف کی وجہ سے برسرِ اقتدار طبقے اپنے مخالفین کی جانیں نہیں لیتے ؟ کیا معمولی معمولی وجوہات کی بنا پر ان کی جائدادیں ضبط نہیں کر لی جاتیں ؟ کیا آئے دن ہم لاتعداد افراد کو سیاسی انتقام کا تختۂ مشق بنتے ہوئے نہیں دیکھتے ؟ آج کی رعایا ظاہری طور پر بھی ماضی کی بہ نسبت حکمرانوں کے ہاتھوں زیادہ ستم زدہ ہے۔ مگر جہاں تک ان زمانے کے حکمرانوں کے چھپے ہوئے مظالم اور جبر و استبداد کا تعلق ہے، ماضی کے حکمرانوں کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ آج کے حکمران گروہ سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ عوام کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں، ان کے اخلاق کو مسخ کرتے ہیں، ان کی غیرت کا جنازہ نکالتے ہیں، مگر ان کی اِن ظالمانہ کارروائیوں کا عوام کو بہت کم احساس ہوتا ہے۔ پہلے حکمران اگر اخلاقی لحاظ سے بگڑتے تو زیادہ سے زیادہ محلات میں رقص و سرود کی محفلیں جما لیتے تھے۔ مگر آج کے حکمران حکومت کے وسیع ذرائع سے کام لے کر مختصر سی مدت میں پوری قوم کو آبرو باختہ بنا دیتے ہیں۔ پہلے جو برائیاں محلات تک اور چند افراد کے درمیان محدود رہتی تھیں وہ اب ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات اور درسی کتابوں کے ذریعہ آناً فاناً پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ انفرادی اصلاح کا پروگرام آخر ان اجتماعی مفاسد کی کس طرح روک تھام کر سکتا ہے جبکہ ان کی پشت پر حکومت کے سارے وسائل ہوں۔

سیاست سے کنارہ کش رہ کر اصلاحِ احوال کی کوشش کرنے والوں کا یہ تیسرا مفروضہ بھی بالکل غلط ہے کہ عوام ملک کی ہیئتِ حاکمہ کو جس طرح چاہیں تشکیل دے کر اس سے اپنی مرضی کے مطابق جو کام لینا چاہیں لے سکتے ہیں۔ ہیئتِ حاکمہ کی تبدیلی بڑا صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور پھر اسے اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ قوم کے غالب رجحانات کے تابع رہ کر کام کرے بڑا دِقت طلب مسئلہ ہے۔ ہیئتِ حاکمہ چند افراد کا نام نہیں جنہیں مسندِ اقتدار سے ہٹا کر اور ان کی جگہ دوسرے افراد کو وہاں بٹھا کر اصلاحی کوششیں کامیاب بنائی

جا سکتی ہیں۔ دورِ جدید میں کسی ملک کی انتظامی مشینری خاص طور پر اس کے اونچے عہدیدار اس ملک کی اجتماعی زندگی کی تشکیل میں پوری قوت سے اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ ان تمام اصلاحی کوششوں کو ناکام بنا دیتے ہیں جنہیں وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ یوں تو ہر ملک میں ہیں، مگر خاص طور پر ان ممالک میں جہاں تختِ اقتدار پر متمکن ہونے والے افراد آمرانہ رجحانات رکھتے ہوں، یہ سیاسی جوڑ توڑ میں ہر لمحہ مصروف رہتے ہیں اور اپنے دل پسند افکار کو مسلط کرنے کی غرض سے اپنے ڈھب کے افراد اور گروہوں کو آگے لانے اور اپنے نظریات کے مخالف تصورات کے علمبردار افراد اور گروہوں کو دبانے کے لیے ہر وقت سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ غیر جمہوری اور نیم جمہوری ممالک میں تو یہ قوم کے سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں۔ اس بنا پر یہ سمجھنا کہ محض تبلیغ کی مدد سے یہ لوگ خود بخود دین کے علمبردار بن جائیں گے، یا حکومت کا مزاج اور نظام آپ سے آپ بدل جائے گا، بہت بڑی خام خیالی ہے۔

اجتماعی زندگی کی غیر معمولی قوت، موجودہ زمانے کی حکومت کا وسیع دائرۂ اختیار، اور ہیئتِ حاکمہ کی زبردست طاقت کو سامنے رکھ کر ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا عملی سیاسیات میں پوری طرح شریک ہوئے بغیر ہم ملک میں کوئی ایسی ہمہ گیر تبدیلی لا سکتے ہیں جس کے ذریعہ یہاں الحاد کے بجائے اسلام کی عملداری قائم ہو اور اللہ کا دین ملک کے رہنے والوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس بن جائے؟ درحقیقت اس تبدیلی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ قوت و طاقت کے اس مرکز کو خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں منتقل کیا جائے جسے عُرفِ عام میں اقتدار کہا جاتا ہے، تاکہ قومی دولت اور ملک کے وسیع ذرائع کفر اور الحاد کو ترقی دینے کے بجائے اسلام کی سربلندی کے لیے صرف ہوں۔ مگر یہ عجیب قسم کی خدا پرستی ہے کہ جس سرزمین کو مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دے کر اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے حاصل کیا تھا، اس پر اگر کچھ لوگ لادینی نظریات مسلط کرنے کی کوشش کریں تو دیندار حضرات ٹھنڈے پیٹیں اس کے خاموش تماشائی بنے رہیں، مگر

جونہی کوئی گروہ ان کے مقابلہ میں اسلامی اصولوں کا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کرے، یہ حضرات فوراً شور مچا دیں کہ یہ تو سیاست بازی اور دنیاداری ہے۔ اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے اپنے منشور میں حسب ذیل مقاصد کا اعلان کیا ہے:

جماعت اسلامی پُرامن آئینی اور جمہوری طریقوں سے نظامِ حکومت کو بدلنا چاہتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانا ہے:

—— جو قرآن و سنت کے اتباع کی پابند اور خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیرو ہو، جس میں اسلام کے اصول و احکام پوری طرح کارفرما ہوں،

—— جو برائی کو مٹائے، نیکی کو پروان چڑھائے اور دنیا میں اللہ کا کلمہ بلند کرے،

—— جو ظلم، ناجائز استحصال اور اخلاقی بے راہ روی کی ہر شکل کو مٹائے، اسلامی اقدار کی بنیاد پر معاشرے کی تعمیرِ نو کرے، اور زندگی کے ہر پہلو میں عدل قائم کر دے،

—— جو ایک خادمِ خلق ریاست ہو، ہر شہری کو اس کی بنیادی ضروریات (غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج) کی فراہمی کی ضمانت دے، رزقِ حلال کے دروازے کھولے، کسبِ حرام کے دروازے بند کرے، تمام جائز ذرائع سے ملک کی دولت بڑھائے اور اس دولت کی منصفانہ تقسیم کا انتظام کرے۔

—— جو لوگوں کے چیخنے چلانے سے پہلے ان کی ضرورتوں کو سمجھے اور فریاد سے پہلے ان کی مدد کو پہنچے،

—— جو درحقیقت عوام کی خیر خواہ ہو اور عوام اس کے خیر خواہ، جس میں لوگوں کے تمام بنیادی حقوق پوری طرح محفوظ ہوں،

—— جو صحیح معنوں میں ایک جمہوری حکومت ہو، عوام اپنی مرضی سے جن لوگوں کو اس کا اقتدار سونپنا چاہیں وہی انتخابات کے ذریعہ سے برسرِ اقتدار آئیں، اور عوام جنہیں اقتدار سے ہٹانا چاہیں انہیں انتخابات کے ذریعہ سے بآسانی ہٹایا جا سکے۔"

تفہیم القرآن

التحریم

(۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے[۱۶] جس پر نہایت تند خو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہونگے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اُسے بجالاتے ہیں[۱۷]۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو،

---

[۱۶] یہ آیت بتاتی ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری صرف اپنی ذات ہی کو خدا کے عذاب سے بچانے کی کوشش تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ نظامِ فطرت نے جس خاندان کی سربراہی کا بار اُس پر ڈالا ہے اس کو بھی وہ اپنی حدِ استطاعت تک ایسی تعلیم و تربیت دے جس سے وہ خدا کے پسندیدہ انسان بنیں، اور اگر وہ جہنم کی راہ پر جا رہے ہوں تو جہاں تک بھی اس کے بس میں ہو، ان کو اس سے روکنے کی کوشش کرے۔ اُس کو صرف یہی فکر نہیں ہونی چاہیے کہ اس کے بال بچے دنیا میں خوشحال ہوں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ وہ آخرت میں جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ حکمراں راعی ہے اور وہ اپنی رعیت کے معاملہ میں جواب دہ ہے۔ مرد اپنے گھر والوں کا راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی راعی ہے اور وہ ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔"

جہنم کا ایندھن پتھر ہونگے، اس سے مراد غالباً پتھر کا کوئلہ ہے۔ ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، مجاہدؒ، امام محمد الباقرؒ اور سُدّیؒ کہتے ہیں کہ یہ گندھک کے پتھر ہونگے۔

[۱۷] یعنی اُن کو جو سزا بھی کسی مجرم پر نافذ کرنے کا حکم دیا جائے گا اُسے جوں کا توں نافذ کرینگے اور ذرا رحم نہ کھائیں گے۔

ع آج معذرتیں پیش نہ کرو، تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جیسے تم عمل کر رہے تھے۔ [۱۸] ع

اَے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ [۱۹]، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور

[۱۸] اِن دونوں آیتوں کا اندازِ بیان اپنے اندر مسلمانوں کے لیے سخت تنبیہ لیے ہوئے ہے۔ پہلی آیت میں مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس خوفناک عذاب سے بچاؤ۔ اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ جہنم میں عذاب دیتے وقت کافروں سے یہ کہا جائے گا۔ اِس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں وہ طرزِ عمل اختیار کرنے سے بچنا چاہیے جس کی بدولت آخرت میں ان کا انجام کافروں کے ساتھ ہو۔

[۱۹] اصل میں تَوْبَۃً نَّصُوْحًا کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ نُصح کے معنی عربی زبان میں خلوص اور خیر خواہی کے ہیں۔ خالص شہد کو عَسَلِ نَاصِح کہتے ہیں جس کو موم اور دوسری آلائشوں سے پاک کر دیا گیا ہو۔ پھٹے ہوتے کپڑے کو سی دینے اور اُدھڑے ہوئے کپڑے کی مرمت کر دینے کے لیے نَصَاحۃ الثَّوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پس توبہ کو نصوح کہنے کا مطلب لغت کے اعتبار سے یا تو یہ ہو گا کہ آدمی ایسی خالص توبہ کرے جس میں ریا اور نفاق کا شائبہ تک نہ ہو۔ یا یہ کہ آدمی خود اپنے نفس کے ساتھ خیر خواہی کرے اور گناہ سے توبہ کر کے اپنے آپ کو بدانجامی سے بچالے۔ یا یہ کہ گناہ سے اس کے دین میں جو شگاف پڑ گیا ہے، توبہ کے ذریعہ سے اس کی اصلاح کر دے۔ یا یہ کہ توبہ کر کے وہ اپنی زندگی کو اتنا سنوار لے کہ دوسروں کے لیے وہ نصیحت کا موجب ہو اور اس کی مثال کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اُسی کی طرح اپنی اصلاح کر لیں۔ یہ تو ہیں توبۂ نصوح کے وہ مفہومات جو اس کے لُغوی معنوں سے مترشح ہوتے ہیں۔ رہا اس کا شرعی مفہوم تو اس کی تشریح ہمیں اُس حدیث میں ملتی ہے جو ابن ابی حاتم نے زِرّ بن حُبَیش کے واسطے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے حضرت اُبَیّ بن کعب سے توبۂ نصوح کا مطلب پوچھا تو انہوں نے کہا مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا "اِس سے مراد یہ ہے کہ جب تم سے کوئی قصور ہو جائے تو اپنے گناہ پر نادم ہو، پھر شرمندگی کے ساتھ اس پر اللہ سے استغفار کرو اور آئندہ کبھی اس فعل کا ارتکاب نہ کرو"۔ یہی مطلب حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، اور ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے توبہ نصوح کی تعریف یہ بیان کی ہے کہ توبہ کے بعد آدمی گناہ کا اعادہ تو درکنار، اُس کے ارتکاب کا ارادہ تک نہ کرے (ابن جریر)۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایک بدّو کو جلدی جلدی توبہ و استغفار کے الفاظ زبان سے ادا کرتے سنا تو فرمایا یہ توبۃُ الکذّابین ہے۔ اس نے پوچھا پھر صحیح توبہ کیا ہے؟ فرمایا، اُس کے ساتھ چھ چیزیں ہونی چاہییں۔

کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ یہ وہ دن ہوگا جب اللہ

(۱) جو کچھ ہو چکا ہے اس پر نادم ہو۔ (۲) اپنے جن فرائض سے غفلت برتی ہو اُن کو ادا کر۔ (۳) جس کا حق مارا ہو اُس کو واپس کر۔ (۴) جس کو تکلیف پہنچائی ہو اُس سے معافی مانگ۔ (۵) آئندہ کے لیے عزم کر لے کہ اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا۔ اور (۶) اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں گھُلا دے جس طرح تو نے اب تک اسے معصیت کا خوگر بنائے رکھا ہے اور اُس کو طاعت کی تلخی کا مزا چکھا جس طرح اب تک تو اُسے معصیتوں کی حلاوت کا مزا چکھاتا رہا ہے۔ (کشاف)

توبہ کے سلسلہ میں چند امور اور بھی ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اوّل یہ کہ توبہ درحقیقت کسی معصیت پر اس لیے نادم ہونا ہے کہ وہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ ورنہ کسی گناہ سے اس لیے پرہیز کا عہد کر لینا کہ وہ مثلاً صحت کے لیے نقصان دہ ہے، یا کسی بدنامی کا، یا مالی نقصان کا موجب ہے، توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ دوسرے یہ کہ جس وقت آدمی کو احساس ہو جائے کہ اس سے اللہ کی نافرمانی ہوئی ہے، اسی وقت اسے توبہ کرنی چاہیے اور جس شکل میں بھی ممکن ہو بلا تاخیر اس کی تلافی کر دینی چاہیے، اُسے ٹالنا مناسب نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ توبہ کر کے بار بار اسے توڑتے چلے جانا اور توبہ کو کھیل بنا لینا اور اسی گناہ کا بار بار اعادہ کرنا جس سے توبہ کی گئی ہو، توبہ کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ توبہ کی اصل روح گناہ پر شرمساری ہے، اور بار بار کی توبہ شکنی اس بات کی علامت ہے کہ اُس کے پیچھے کوئی شرمساری موجود نہیں ہے۔ چوتھے یہ کہ جو شخص سچے دل سے توبہ کر کے یہ عزم کر چکا ہو کہ پھر اس گناہ کا اعادہ نہ کرے گا، اس سے اگر بشری کمزوری کی بنا پر اُسی گناہ کا اعادہ ہو جائے تو پچھلا گناہ تازہ نہ ہوگا، البتہ اسے بعد والے گناہ پر پھر توبہ کرنی چاہیے اور زیادہ سختی کے ساتھ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ توبہ شکنی کا مرتکب نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ ہر مرتبہ جب معصیت یاد آئے، توبہ کی تجدید کرنا لازم نہیں ہے، لیکن اگر اُس کا نفس اپنی سابق گناہ گارانہ زندگی کی یاد سے لطف لے رہا ہو تو بار بار توبہ کرنی چاہیے یہاں تک کہ گناہوں کی یاد اس کے لیے لذت کے بجائے شرمساری کی موجب بن جائے۔ اس لیے کہ جس شخص نے فی الواقع خدا کے خوف کی بنا پر معصیت سے توبہ کی ہو وہ اس خیال سے لذت نہیں لے سکتا کہ وہ خدا کی نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اُس سے لذت لینا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے خوف نے اس کے دل میں جڑ نہیں پکڑی ہے۔

نلہ آیت کے الفاظ قابلِ غور ہیں۔ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ توبہ کر لو تو تمہیں ضرور معاف کر دیا جائے گا اور لازماً تم جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے، بلکہ یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر تم سچے دل سے توبہ کرو گے تو بعید نہیں کہ اللہ

اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں رُسوا نہ کرے گا۔[۲۱] اُن کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہونگے کہ اے ہمارے رب، ہمارا نور ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہم سے درگزر فرما، تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے[۲۲]۔

تمہارے ساتھ یہ معاملہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گناہ گار کی توبہ قبول کر لینا اور اسے سزا دینے کے بجائے جنت عطا فرما دینا اللہ پر واجب نہیں ہے، بلکہ یہ سراسر اس کی عنایت و مہربانی ہو گی کہ وہ معاف بھی کرے اور انعام بھی دے۔ بندے کو اس سے معافی کی امید تو ضرور رکھنی چاہیے مگر اس بھروسے پر گناہ نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ سے معافی مل جائے گی۔

[۲۱] یعنی اُن کے اعمالِ حسنہ کا اجر ضائع نہ کرے گا۔ کفار و منافقین کو یہ کہنے کا موقع ہرگز نہ دے گا کہ ان لوگوں نے خدا پرستی بھی کی تو اس کا کیا صلہ پایا۔ رسوائی باغیوں اور نافرمانوں کے حصے میں آئے گی نہ کہ وفاداروں اور فرماں برداروں کے حصے میں۔

[۲۲] اس آیت کو سُورۂ حدید کی آیات ۱۲-۱۳ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ ایمان کے آگے آگے نُور کے دوڑنے کی یہ کیفیت اُس وقت پیش آئے گی جب وہ میدانِ حشر سے جنت کی طرف جا رہے ہونگے۔ وہاں ہر طرف گھُپ اندھیرا ہوگا جس میں وہ سب لوگ ٹھوکریں کھا رہے ہونگے جن کے حق میں دوزخ کا فیصلہ ہوگا۔ اور روشنی صرف اہلِ ایمان کے ساتھ ہو گی جس کے سہارے وہ اپنا راستہ طے کر رہے ہونگے۔ اس نازک موقع پر تاریکیوں میں بھٹکنے والے لوگوں کی آہ و فغاں سن سن کر اہلِ ایمان پر خشیت کی کیفیت طاری ہو رہی ہو گی، اپنے قصوروں اور اپنی کوتاہیوں کا احساس کر کے انہیں اندیشہ لاحق ہوگا کہ کہیں ہمارا نور بھی نہ چھین جائے اور ہم ان بدبختوں کی طرح ٹھوکریں کھاتے نہ رہ جائیں، اس لیے وہ دعا کریں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے قصور معاف فرما دے اور ہمارے نور کو جنت میں پہنچنے تک ہمارے لیے باقی رکھ۔ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ "رَبَّنَآ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں گے کہ ان کا نور اُس وقت تک باقی رکھا جائے اور اسے بجھنے نہ دیا جائے جب تک وہ پل صراط سے بخیریت نہ گزر جائیں"۔ حضرت حسن بصری اور مجاہد اور ضحاک کی تفسیر بھی قریب قریب یہی ہے۔ ابن کثیر نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اہلِ ایمان جب دیکھیں گے کہ منافقین نور سے محروم رہ گئے ہیں تو وہ اپنے حق میں اللہ سے تکمیلِ نور کی دعا کریں گے"۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۃ الحدید، حاشیہ ۱۷)۔

اے نبی، کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ[۲۳]۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

اللہ کافروں کے معاملہ میں نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کو بطورِ مثال پیش کرتا ہے۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کی زوجیت میں تھیں، مگر انہوں نے اپنے ان شوہروں سے خیانت کی[۲۴] اور وہ اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ بھی نہ کام آسکے۔ دونوں سے کہہ دیا گیا کہ جاؤ آگ میں جانے والوں کے ساتھ تم بھی چلی جاؤ۔ اور اہلِ ایمان کے معاملہ میں اللہ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے جبکہ اُس نے دُعا کی "اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے[۲۵] اور ظالم قوم سے مجھ کو نجات دے"۔ اور عمران کی بیٹی مریمؑ[۲۶] کی مثال دیتا ہے جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی[۲۷]۔

---

۲۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۸۲۔

۲۴ یہ خیانت اِس معنی میں نہیں ہے کہ وہ بدکاری کی مرتکب ہوئی تھیں، بلکہ اس معنی میں ہے کہ انہوں نے ایمان کی راہ میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کا ساتھ نہ دیا بلکہ ان کے مقابلہ میں دشمنانِ دین کا ساتھ دیتی رہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ "کسی نبی کی بیوی کبھی بدکار نہیں رہی ہے۔ ان دونوں عورتوں کی خیانت دراصل دین کے معاملہ میں تھی۔ انہوں نے حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کا دین قبول نہیں کیا۔ حضرت نوحؑ کی بیوی اپنی قوم کے جباروں کو ایمان لانے والوں کی خبریں پہنچایا کرتی تھی۔ اور حضرت لوطؑ کی بیوی اپنے شوہر کے ہاں آنے والے لوگوں کی اطلاع اپنی قوم کے بداعمال لوگوں کو دے دیا کرتی تھی"۔ (ابن جریر)

۲۵ یعنی فرعون جو بُرے اعمال کر رہا ہے ان کے انجامِ بد میں مجھے شریک نہ کر۔

۲۶ ہوسکتا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد ہی کا نام عمران ہو، یا ان کو عمران کی بیٹی اس لیے کہا گیا ہو کہ وہ آلِ عمران سے تھیں۔

۲۷ یہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید ہے کہ ان کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش معاذ اللہ کسی گناہ کا نتیجہ تھی۔ سورۂ نساء، آیت ۱۵۶ میں ان ظالموں کے اسی الزام کو بہتانِ عظیم قرار دیا گیا ہے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، سورۃ النساء، حاشیہ ۱۹۰)۔

پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے رُوح پھونک دی[۲۸]، اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی[۲۹]۔ ع ۲

[۲۸] یعنی بغیر اس کے کہ ان کا کسی مرد سے تعلق ہوتا، اُن کے رحم میں اپنی طرف سے ایک جان ڈال دی۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حواشی ۲۱۲-۲۱۳- جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۸۹)۔

[۲۹] جس مقصد کے لیے اِن تین قسم کی عورتوں کو مثال میں پیش کیا گیا ہے اس کی تشریح ہم اس سُورہ کے دیباچے میں کر چکے ہیں، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

تفہیم القرآن

المُلک

نام | پہلے فقرے تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ کے لفظ المُلک کو اس سُورہ کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | کسی مُعتبر روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کس زمانے میں نازل ہوئی ہے، مگر مضامین اور اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکۂ معظمہ کے ابتدائی دَور کی نازل شدہ سُورتوں میں سے ہے

موضوع اور مضمون | اس میں ایک طرف مختصر طریقے سے اسلام کی تعلیمات کا تعارف کرایا گیا ہے اور دوسری طرف بڑے مؤثر انداز میں اُن لوگوں کو چونکایا گیا ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مکۂ معظمہ کی ابتدائی سُورتوں کی خصوصیت ہے کہ وہ اسلام کی ساری تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو پیش کرتی ہیں، مگر تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ، تاکہ وہ بتدریج لوگوں کے ذہن نشین ہوتی چلی جائیں۔ اس کے ساتھ ان میں زیادہ تر زور اس بات پر صرف کیا جاتا ہے کہ لوگوں کی غفلت دُور کی جائے، ان کو سوچنے پر مجبور کیا جائے، اور ان کے سوتے ہوئے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

پہلی پانچ آیتوں میں انسان کو احساس دلایا گیا ہے کہ وہ جس کائنات میں رہتا ہے وہ ایک انتہائی منظم اور محکم سلطنت ہے جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی عیب یا نقص یا خلل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سلطنت کو عدم سے وجود میں بھی اللہ تعالیٰ ہی لایا ہے اور اس کی تدبیر و انتظام اور فرمانروائی کے تمام اختیارات بھی بالکلیہ اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کی قدرت لامحدود ہے۔ اِس کے ساتھ انسان کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اِس انتہائی حکیمانہ نظام میں وہ بے مقصد پیدا نہیں کر دیا گیا ہے بلکہ یہاں اسے امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، اور اِس امتحان میں وہ اپنے حسنِ عمل ہی سے کامیاب ہو سکتا ہے۔

آیت ۶ سے ۱۱ تک کفر کے وہ ہولناک نتائج بیان کیے گئے ہیں جو آخرت میں نکلنے والے ہیں اور لوگوں کو بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو بھیج کر تمہیں اسی دنیا میں اِن نتائج سے خبردار کر دیا ہے۔ اب اگر یہاں تم انبیاء کی بات مان کر اپنا رویہ درست نہ کرو گے تو آخرت میں تمہیں خود اعتراف کرنا پڑے گا کہ جو سزا تم کو دی جا رہی ہے فی الواقع تم اس کے مستحق ہو۔

آیت ۱۲ سے ۱۴ تک یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ وہ تمہاری ہر کھلی اور چھپی بات، حتیٰ کہ تمہارے دل کے خیالات تک سے واقف ہے۔ لہٰذا اخلاق کی صحیح بنیاد یہ ہے کہ انسان اُس اَن دیکھے خدا کی بازپرس سے ڈر کر بُرائی سے بچے، خواہ دنیا میں کوئی طاقت اس پر گرفت کرنے والی ہو یا نہ ہو اور دنیا میں اس سے کسی نقصان کا امکان ہو یا نہ ہو۔ یہ طرزِ عمل جو لوگ اختیار کریں گے وہی آخرت میں بخشش اور اجرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔

آیت ۱۵ سے ۲۳ تک اُن پیش پا افتادہ حقیقتوں کی طرف جنہیں انسان دنیا کے معمولات سمجھ کر قابلِ توجہ شمار نہیں کرتا، پے در پے اشارے کر کے ان پر سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اِس زمین کو دیکھو جس پر تم اطمینان سے چل پھر رہے ہو اور جس سے اپنا رزق حاصل کر رہے ہو۔ خدا ہی نے اسے تمہارے لیے تابع کر رکھا ہے، ورنہ کسی وقت بھی اِس زمین میں ایسا زلزلہ آ سکتا ہے کہ تم پیوند خاک ہو جاؤ، یا ہوا کا ایسا طوفان آ سکتا ہے جو تمہیں تہس نہس کر کے رکھ دے۔ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو دیکھو۔ خدا ہی تو ہے جو انہیں فضا میں تھامے ہوئے ہے۔ اپنے تمام ذرائع و وسائل پر نگاہ ڈال کر دیکھو۔ خدا اگر تمہیں عذاب میں مبتلا کرنا چاہے تو کون تمہیں اس سے بچا سکتا ہے اور خدا اگر تمہارے لیے رزق کے دروازے بند کر دے تو کون انہیں کھول سکتا ہے؟ یہ ساری چیزیں تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کے لیے موجود ہیں، مگر انہیں تم حیوانات کی طرح دیکھتے ہو جو مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اور اُس سماعت و بینائی اور اُن سوچنے سمجھنے والے دماغوں سے کام نہیں لیتے جو انسان ہونے کی حیثیت سے خدا نے تمہیں دیے ہیں۔ اسی وجہ سے راہِ راست تمہیں نظر نہیں آتی۔

آیت ۲۴ سے ۲۷ تک بتایا گیا ہے کہ آخر کار تمہیں لازماً اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے۔ نبی کا کام یہ نہیں ہے کہ تمہیں اس کے آنے کا وقت اور تاریخ بتائے۔ اُس کا کام بس یہ ہے کہ تمہیں اُس آنے والے وقت سے پیشگی خبردار کر دے۔ تم آج اس کی بات نہیں مانتے اور مطالبہ کرتے ہو کہ

وہ وقت لاکر تمہیں دکھا یا جاتے ۔ مگر جب وہ آجائے گا اور تم آنکھوں سے اسے دیکھ لوگے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے ۔ اس وقت تم سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جسے جلدی لے آنے کا تم مطالبہ کر رہے تھے ۔

آیت ۲۸ اور ۲۹ میں کفارِ مکہ کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے خلاف کرتے تھے ۔ وہ حضورؐ کو کوستے تھے اور آپؐ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے ہلاکت کی دعائیں مانگتے تھے ۔ اس پر فرمایا گیا ہے کہ تمہیں راہِ راست کی طرف بلانے والے خواہ ہلاک ہوں یا اللہ ان پر رحم کرے ، اس سے آخر تمہاری قسمت کیسے بدل جائے گی ؟ تم اپنی فکر کرو کہ خدا کا عذاب اگر تم پر آجائے تو کون تمہیں بچائے گا ؟ جو لوگ خدا پر ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے اُس پر توکل کیا ہے ، انہیں تم گمراہ سمجھ رہے ہو ۔ ایک وقت آئے گا جب یہ بات کھل جائے گی کہ حقیقت میں گمراہ کون تھا ۔

آخر میں لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا ہے اور اسی پر سوچنے کے لیے انہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ عرب کے صحراؤں اور پہاڑی علاقوں میں ، جہاں تمہاری زندگی کا سارا انحصار اُس پانی پر ہے جو کسی جگہ زمین سے نکل آیا ہے ، وہاں اگر یہ پانی زمین میں اتر کر غائب ہو جائے تو خدا کے سوا کون تمہیں یہ آبِ حیات لاکر دے سکتا ہے ؟

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

نہایت بزرگ و برتر ہے[1] وہ جس کے ہاتھ میں کائنات کی سلطنت ہے[2]، اور وہ ہر چیز پر قدرت

---

[1] تَبَارَکَ برکت سے مبالغہ کا صیغہ ہے ۔ برکت میں رفعت و عظمت ، افزائش اور فراوانی ، دوام و ثبات ، اور کثرتِ خیرات و حسنات کے مفہومات شامل ہیں ۔ اس سے جب مبالغہ کا صیغہ تَبَارَکَ بنایا جائے تو اس کے معنی یہ ہو جاتے ہیں کہ وہ بے انتہا بزرگ و عظیم ہے ، اپنی ذات و صفات و افعال میں اپنے سوا ہر ایک سے بالاتر ہے ، بے حد و حساب بھلائیوں کا فیضان اس کی ذات سے ہو رہا ہے ، اور اس کے کمالات لازوال ہیں ۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن ، جلد دوم ، الاعراف ، حاشیہ ۴۳ ، جلد سوم ، المومنون ، حاشیہ ۱۴ ۔ الفرقان ، حواشی ۱ و ۱۹) ۔

[2] اَلْمُلْکُ کا لفظ چونکہ مطلقاً استعمال ہوا ہے اس لیے اسے کسی محدود معنوں میں نہیں لیا جا سکتا ۔ لامحالہ

رکھتا ہے۔[۱] جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے[۲]، اور وہ زبردست بھی ہے اور درگزر فرمانے والا بھی[۳] جس نے تہ بر تہ سات آسمان بنائے[۴] تم رحمان کی

اس سے مراد تمام موجوداتِ عالم پر شاہانہ اقتدار ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں اقتدار ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جسمانی ہاتھ رکھتا ہے، بلکہ یہ لفظ محاورہ کے طور پر قبضہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ عربی کی طرح ہماری زبان میں بھی جب یہ کہتے ہیں کہ اختیارات فلاں کے ہاتھ میں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہی سارے اختیارات کا مالک ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں ہے۔

[۱] یعنی وہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی چیز اُسے عاجز کرنے والی نہیں ہے کہ وہ کوئی کام کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔

[۲] یعنی دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور بُرائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ممتحن کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہو گا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔

[۳] اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں۔ ایک یہ کہ وہ بے انتہا زبردست اور سب پر پوری طرح غالب ہونے کے باوجود اپنی مخلوق کے حق میں رحیم و غفور ہے، ظالم اور سخت گیر نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ بُرے عمل کرنے والوں کو سزا دینے کی وہ پوری قدرت رکھتا ہے، کسی میں یہ طاقت نہیں کہ اس کی سزا سے بچ نکلے، مگر جو نادم ہو کر بُرائی سے باز آ جائے اور معافی مانگ لے اس کے ساتھ وہ درگزر کا معاملہ کرنے والا ہے۔

تخلیق میں کسی قسم کی بے ربطی نہ پاؤ گے۔[۷] پھر پلٹ کر دیکھو، کہیں تمہیں کوئی خلل[۸] نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ۔ تمہاری نگاہ تھک کر نامراد پلٹ آئے گی۔

ہم نے تمہارے قریب کے آسمان[۹] کو عظیم الشان چراغوں سے آراستہ کیا ہے[۱۰] اور انہیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ بنا دیا ہے[۱۱]۔ ان شیطانوں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ ہم نے مہیا کر رکھی ہے۔

۶؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ حاشیہ ۳۴۔ جلد دوم، الرعد، حاشیہ ۲۔ الحجر، حاشیہ ۸۔ جلد سوم، الحج، حاشیہ ۱۱۳۔ المومنون، حاشیہ ۱۵۔ جلد چہارم، الصّافات، حاشیہ ۵۔ المومن، حاشیہ ۹۰۔

۷؎ اصل میں تفاوُت کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں، عدمِ تناسُب۔ ایک چیز کا دوسری چیز سے میل نہ کھانا۔ اَن مِل بے جوڑ ہونا۔ پس اِس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں تم کہیں بدنظمی، بے ترتیبی اور بے ربطی نہ پاؤ گے۔ اللہ کی پیدا کردہ اِس دنیا میں کوئی چیز اَن مِل بے جوڑ نہیں ہے۔ اس کے تمام اجزاء باہم مربوط ہیں اور ان میں کمال درجے کا تناسُب پایا جاتا ہے۔

۸؎ اصل میں لفظ فُطور استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں دراڑ، شگاف، رخنہ، پھٹا ہوا ہونا، ٹوٹا پھوٹا ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کی بندش ایسی چُست ہے، اور زمین کے ایک ذرّے سے لے کر عظیم الشان کہکشانوں تک ہر چیز ایسی مربوط ہے کہ کہیں نظمِ کائنات کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ تم خواہ کتنی ہی جستجو کر لو، تمہیں اس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں مل سکتا۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ ق، حاشیہ ۸)

۹؎ قریب کے آسمان سے مراد وہ آسمان ہے جس کے تاروں اور سیاروں کو ہم برہنہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے جن چیزوں کے مشاہدے کے لیے آلات کی ضرورت پیش آتی ہو وہ دُور کے آسمان ہیں۔ اور ان سے بھی زیادہ دُور کے آسمان وہ ہیں جن تک آلات کی رسائی بھی نہیں ہے۔

۱۰؎ اصل میں لفظ "مصابیح" نکرہ استعمال ہوا ہے اور اس کے نکرہ ہونے سے خود بخود اِن چراغوں کے عظیم الشان ہونے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ کائنات ہم نے اندھیری اور سُونی نہیں بنائی ہے بلکہ اسے تاروں سے خوب مزیّن اور آراستہ کیا ہے جس کی شان اور جگمگاہٹ رات کے اندھیروں میں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

۱۱؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں کو پھینک مارے جاتے ہیں، اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہابِ ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گرتے ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد و حساب

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے[۱۲] ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جب وہ اس میں پھینکے جائیں گے تو اس کے دہاڑنے کی ہولناک آواز سنیں گے[۱۳] اور وہ جوش کھا رہی ہوگی،

شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں، اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالمِ بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہاب انہیں مار بھگاتے ہیں۔ اس چیز کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عرب کے لوگ کاہنوں کے متعلق یہ خیال رکھتے تھے اور یہی خود کاہنوں کا دعویٰ بھی تھا، کہ شیاطین ان کے تابع ہیں، یا شیاطین سے ان کا رابطہ ہے، اور ان کے ذریعہ سے انہیں غیب کی خبریں حاصل ہوتی ہیں اور وہ صحیح طور پر لوگوں کی قسمتوں کا حال بتا سکتے ہیں۔ اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین کے عالمِ بالا میں جانے اور وہاں سے غیب کی خبریں معلوم کرنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، الحجر، حواشی ۹ تا ۱۲۔ الصافات، حواشی ۶-۷)۔

رہا یہ سوال کہ ان شہابیوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معاینے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آکر ادھر کا رُخ کر لیتے ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ایڈیشن ۱۹۶۷ء۔ جلد ۱۵۔ لفظ METEORITES)۔

[۱۲] یعنی انسان ہوں، یا شیطان، جن لوگوں نے بھی اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کا یہ انجام ہے۔ رب سے کفر کرنے کے مفہوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۶۱۔ النساء، حاشیہ ۱۷۸۔ جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۳۹۔ جلد چہارم، المومن، حاشیہ ۳۔

[۱۳] اصل میں لفظ شہیق استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنم سے آ رہی ہوگی جہاں ان لوگوں سے پہلے گرے ہوئے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔ اس دوسرے مفہوم کی تائید سورۂ ہود کی آیت ۱۰۶ سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ "ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے"۔ لو

شدتِ غضب سے پھٹی جاتی ہوگی۔ ہر بار جب کوئی انبوہ اس میں ڈالا جائے گا، اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے "کیا تمہارے پاس کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا؟" وہ جواب دیں گے "ہاں خبردار

پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان آیت ۱۲ سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ دُور ہی سے اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔ اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ یہ شور خود جہنّم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔

ﷲ اس سوال کی اصل نوعیت سوال کی نہیں ہوگی کہ جہنّم کے کارندے ان لوگوں سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہوں کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خبردار کرنے والا آیا تھا یا نہیں، بلکہ اس سے مقصود اُن کو اِس بات کا قائل کرنا ہوگا کہ انہیں جہنّم میں ڈال کر اُن کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی جا رہی ہے۔ اس لیے وہ خود ان کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے خبر نہیں رکھا تھا۔ ان کے پاس انبیاءؑ بھیجے تھے۔ اُن کو بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور راہِ راست کونسی ہے، اور ان کو متنبہ کر دیا تھا کہ اس راہِ راست کے خلاف چلنے کا نتیجہ اِسی جہنّم کا ایندھن بننا ہوگا جس میں اب وہ جھونکے گئے ہیں۔ مگر انہوں نے انبیاء کی بات نہ مانی، لہٰذا اب جو سزا انہیں دی جا رہی ہے وہ فی الواقع اس کے مستحق ہیں۔

یہ بات قرآن مجید میں بار بار ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس امتحان کے لیے دنیا میں انسان کو بھیجا ہے وہ اِس طرح نہیں لیا جا رہا ہے کہ اُسے بالکل بے خبر رکھ کر یہ دیکھا جا رہا ہو کہ وہ خود راہِ راست پاتا ہے یا نہیں، بلکہ اسے راہِ راست بتانے کا جو معقول ترین انتظام ممکن تھا وہ اللہ نے پُوری طرح کر دیا ہے، اور وہ یہی انتظام ہے کہ انبیاءؑ بھیجے گئے ہیں اور کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اب انسان کا سارا امتحان اس امر میں ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کو مان کر سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے یا ان سے مُنہ موڑ کر خود اپنی خواہشات اور تخیلات کے پیچھے چلتا ہے۔ اِس طرح نبوت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی وہ حجّت ہے جو اس نے انسان پر قائم کر دی ہے، اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر انسان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ انبیاء کے آنے کے بعد کوئی شخص یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ ہم حقیقت سے آگاہ نہ تھے، ہمیں اندھیرے میں رکھ کر ہم کو اتنے بڑے امتحان میں ڈال دیا گیا، اور اب ہمیں بے قصور سزا دی جا رہی ہے۔ اِس مضمون کو اِتنی بار اِتنے مختلف طریقوں سے قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ مثال

کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا۔ مگر ہم نے اسے جھٹلا دیا اور کہا اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا ہے، تم بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو[۱۵] اور وہ کہیں گے " کاش ہم سنتے یا سمجھتے[۱۶] تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے " اس طرح وہ اپنے قصور[۱۷] کا خود اعتراف کریں گے، لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔

جو لوگ بے دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں[۱۸]، یقیناً اُن کے لیے مغفرت ہے اور بڑا اجر[۱۹]۔ تم خواہ

کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، آیت ۲۱۳، حاشیہ ۲۳۰۔ النساء، آیات ۴۱-۴۲، حاشیہ ۶۴۔ آیت ۱۶۵، حاشیہ ۲۰۸۔ الانعام، آیات ۱۳۰-۱۳۱، حواشی ۹۸ تا ۱۰۰۔ جلد دوم بنی اسرائیل، آیت ۱۵، حاشیہ ۱۷۔ جلد سوم، طٰہٰ، آیت ۱۳۴۔ القصص، آیت ۴۷، حاشیہ ۶۶۔ آیت ۵۹، حاشیہ ۸۳۔ آیت ۶۵۔ جلد چہارم، فاطر، آیت ۳۷۔ المومن، آیت ۵۰، حاشیہ ۶۶۔

[۱۵] یعنی تم بھی بہکے ہوئے ہو اور تم پر ایمان لانے والے لوگ بھی سخت گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

[۱۶] یعنی ہم نے طالب حق بن کر انبیاء کی بات کو توجہ سے سنا ہوتا، یا عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی کہ فی الواقع وہ بات کیا ہے جو وہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہاں سننے کو سمجھنے پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے نبی کی تعلیم کو توجہ سے سننا (یا اگر وہ لکھی ہوئی شکل میں ہو تو طالب حق بن کر اسے پڑھنا) ہدایت پانے کے لیے شرط اوّل ہے۔ اُس پر غور کر کے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنے کا مرتبہ اس کے بعد آتا ہے۔ نبی کی رہنمائی کے بغیر اپنی عقل سے بطورِ خود کام لے کر انسان براہِ راست حق تک نہیں پہنچ سکتا۔

[۱۷] قصور کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اصل قصور جس کی بنا پر وہ جہنم کے مستحق ہوئے رسولوں کا جھٹلانا اور ان کی پیروی سے انکار کرنا ہے۔ باقی سارے گناہ اُسی کی فرع ہیں۔

[۱۸] یہ دین میں اخلاق کی اصل جڑ ہے۔ کسی کا برائی سے اس لیے بچنا کہ اس کی ذاتی رائے میں وہ برائی ہے، یا دنیا اسے بُرا سمجھتی ہے، یا اس کے ارتکاب سے دنیا میں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، یا اس پر کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ ہے، یہ اخلاق کے لیے ایک بہت ہی ناپائدار بنیاد ہے۔ آدمی کی ذاتی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، وہ اپنے کسی فلسفے کی وجہ سے ایک اچھی چیز کو بُرا اور ایک بُری چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کے معیارِ خیر و شر اوّل تو یکساں نہیں ہیں، پھر وہ وقتاً فوقتاً بدلتے بھی رہتے ہیں۔ کوئی عالمگیر اور ازلی و ابدی معیار نہ آج پایا جاتا ہے نہ کبھی پایا گیا ہے۔ دنیوی نقصان کا اندیشہ بھی اخلاق کے لیے کوئی مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ جو شخص

چپکے سے بات کرو یا اونچی آواز سے (اللہ کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے[۲۰]۔ کیا وہی نہ
جانے گا جس نے پیدا کیا ہے[۲۱]؟ حالانکہ وہ باریک بیں[۲۲] اور باخبر ہے۔ ع

بُرائی سے اس لیے بچتا ہو کہ وہ دنیا میں اس کی ذات پر مترتب ہونے والے کسی نقصان سے ڈرتا ہے وہ ایسی حالت میں اس کے ارتکاب سے باز نہیں رہ سکتا جبکہ اس سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح کسی دنیوی طاقت کی گرفت کا خطرہ بھی وہ چیز نہیں ہے جو انسان کو ایک شریف انسان بنا سکتی ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی دنیوی طاقت بھی عالم الغیب والشہادہ نہیں ہے۔ بہت سے جرائم اس کی نگاہ سے بچ کر کیے جا سکتے ہیں۔ اور ہر دنیوی طاقت کی گرفت سے بچنے کی بے شمار تدبیریں ممکن ہیں پھر کسی دنیوی طاقت کے قوانین بھی تمام بُرائیوں کا احاطہ نہیں کرتے۔ بیشتر برائیاں ایسی ہیں جن پر دنیوی قوانین کوئی گرفت سرے سے کرتے ہی نہیں، حالانکہ وہ اُن برائیوں سے شنیع تر ہیں جن پر وہ گرفت کرتے ہیں۔ اِس لیے دینِ حق نے اخلاق کی پُوری عمارت اس بنیاد پر کھڑی کی ہے کہ اُس اَن دیکھے خدا سے ڈر کر بُرائی سے اجتناب کیا جائے جو ہر حال میں انسان کو دیکھ رہا ہے، جس کی گرفت سے انسان بچ کر کہیں نہیں جا سکتا، جس نے خیر و شر کا ایک ہمہ گیر، عالمگیر اور مستقل معیار انسان کو دیا ہے۔ اُسی کے ڈر سے بدی کو چھوڑنا اور نیکی کو اختیار کرنا وہ اصل بھلائی ہے جو دین کی نگاہ میں قابلِ قدر ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری وجہ سے اگر کوئی انسان بدی نہیں کرتا، یا اپنی ظاہری شکل کے اعتبار سے جو افعال نیکی میں شمار ہوتے ہیں اُن کو اختیار کرتا ہے تو آخرت میں اس کے یہ اخلاق کسی قدر اور وزن کے مستحق نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی مثال اُس عمارت کی سی ہے جو ریت پر تعمیر ہوئی ہو۔

[۱۹] یعنی خدا سے بالغیب ڈرنے کے دو لازمی نتائج ہیں۔ ایک یہ کہ جو قصور بھی بشری کمزوریوں کی بنا پر آدمی سے سرزد ہو گئے ہوں وہ معاف کر دیئے جائیں گے، بشرطیکہ ان کی تہ میں خدا سے بے خوفی کارفرما نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جو نیک اعمال بھی انسان اس عقیدے کے ساتھ انجام دے گا اُس پر وہ بڑا اجر پائے گا۔

[۲۰] یہ بات تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمائی گئی ہے، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر۔ مومن کے لیے اس میں یہ تلقین ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہر وقت یہ احساس اپنے ذہن میں تازہ رکھنا چاہیے کہ اس کے کھلے اور چھپے اقوال و اعمال ہی نہیں، اس کی نیتیں اور اس کے خیالات تک اللہ سے مخفی نہیں ہیں۔ اور کافر کے لیے اس میں یہ تنبیہ ہے کہ وہ اپنی جگہ خدا سے بے خوف ہو کر جو کچھ چاہے کرتا رہے، اس کی کوئی

بات اللہ کی گرفت سے چھوٹی نہیں رہ سکتی۔

لکہ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "کیا وہ اپنی مخلوق ہی کو نہ جانے گا ؟" اصل میں مَنْ خَلَقَ استعمال ہُوا ہے۔ اس کے معنی "جس نے پیدا کیا ہے" بھی ہو سکتے ہیں، اور "جس کو اُس نے پیدا کیا ہے" بھی۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ یہ دلیل ہے اُس بات کی جو اُوپر کے فقرے میں ارشاد ہوئی ہے یعنی آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے بے خبر ہو؟ مخلوق خود اپنے آپ سے بے خبر ہوسکتی ہے، مگر خالق اُس سے بے خبر نہیں ہوسکتا۔ تمہاری رگ رگ اس نے بنائی ہے۔ تمہارے دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اس کا بنایا ہُوا ہے۔ تمہارا ہر سانس اس کے جاری رکھنے سے جاری ہے۔ تمہارا ہر عضو اس کی تدبیر سے کام کر رہا ہے۔ اُس سے تمہاری کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے ؟

۲۲ہ اصل میں لفظ "لطیف" استعمال ہُوا ہے جس کے معنی غیر محسوس طریقے سے کام کرنے والے کے بھی ہیں اور پوشیدہ حقائق کو جاننے والے کے بھی۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۸)

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ حضرت حجر بن عدیؓ کے قتل کو جائز ثابت کرنے میں اپنا زورِ استدلال صرف کرنے کے بعد مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے یزید کی ولی عہدی کو جائز قرار دینے میں بھی بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ یہ صورتِ حال فی الواقع بڑی عبرت انگیز ہے کہ مولانا مودودی کی تردید و تغلیط کے جوش میں مولانا عثمانی صاحب کو اس امر کا احساس نہیں رہا کہ وہ اسلامی قوانین کا حلیہ کس طرح بگاڑ کر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ پہلے انہوں نے اسلامی حکومت کی انتظامیہ و عدلیہ کی یہ تصویر ہمارے سامنے رکھی کہ اس کے ارکان جو ظلم و عدوان چاہیں، کرتے رہیں، وہ مواخذے سے بالاتر ہیں۔ پھر انہوں نے اسلامی قانونِ بغاوت اور اسلامی حقوقِ شہریت کی یہ تعبیر پیش کی کہ حکومت جس "انتشار پسند" کو چاہے باغی قرار دے دے اور اُسے بیان یا صفائی کا موقع دیئے بغیر اس کا سر تن سے جُدا کر دے۔ اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر اُمّت کا اجماع منعقد ہو چکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر اپنے بیٹے یا دوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اُسے ولی عہد بنا سکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمان ان دونوں میں سے جس طرزِ حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں۔

اسلام کا نظریۂ حکمرانی ایک ایسا اہم اور وسیع موضوع ہے کہ اس پر سیر حاصل بحث کے لیے ایک مضمون کے بجائے ایک کتاب درکار ہے۔ جب تک قرآن مجید، اُسوۂ رسالت اور اُسوۂ خلافت راشدہ کی روشنی میں اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ نہ لیا جائے، اسلام کا نظریۂ حکومت واضح نہیں ہو سکتا اور مولانا عثمانی

صاحب کے موقف کی غلطی پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی۔ لیکن یہاں اس محدود مضمون کی تنگ دامنی میری راہ میں حائل ہے۔ تاہم میں قارئین سے درخواست کروں گا کہ اس موضوع پر جو مفصل تحریریں مولانا مودودی کے قلم سے نکل چکی ہیں، انہیں ضرور پڑھیں۔ خود ان کی اسی کتاب "خلافت و ملوکیت" کے ابتدائی ابواب اسی بحث سے متعلق ہیں۔ مولانا عثمانی صاحب بھی آغازِ تنقید میں ان پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔ اگر وہ بھی یادداشت تازہ کرنے کی غرض سے ان پر دوبارہ نگاہ ڈال لیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔ اس کے بعد اس موضوع پر اب چند مزید ضروری گزارشات میں بھی پیش کروں گا۔

خلفائے راشدین کا انتخاب یہ حقیقت تو ظاہر و باہر ہے کہ اسلامی ریاست کے اولین امیر سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے منتخب کردہ یا نامزد کردہ امیر نہ تھے، نہ آپ نے اپنی سعی یا زور سے منصبِ امارت حاصل کیا تھا۔ بلکہ آنحضورؐ کو احکم الحاکمین اور رب العالمین نے خود خلعتِ نبوت سے سرفراز فرمایا تھا اور آپ کی امارت و امامت آپ کے منصبِ نبوت و رسالت ہی کا ایک جزوِ لاینفک تھی۔ آنحضورؐ کے وصال پر البتہ یہ اہم سوال پیدا ہوتا تھا کہ آپ کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امیر کون ہو اور اس کی امارت کا انعقاد کیسے ہو؟ اسلام میں اگر سب سے بڑھ کر کسی امیر کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد کر کے اس کی بیعت اپنی زندگی میں لے لے تو وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے تھے۔ آپؐ کے خاندان میں خلافت کی اہلیت رکھنے والے مفقود بھی نہ تھے۔ یہ کام اگر اسلام میں پسندیدہ کام ہوتا تو اس کی ابتدا کرنے کے سب سے زیادہ حق دار خود حضورؐ تھے۔ لیکن سب کو معلوم ہے اور اہلِ سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ نے یہ کام نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے اپنے خاندان سے باہر بھی کسی کو خلیفہ نامزد کر کے اس کی بیعت نہ لی۔ اس مسئلے میں جو مستند ترین احادیث وارد ہیں وہ اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ خود آنحضورؐ اپنی جانشینی کے معاملے میں ایک گونہ فکر مند تھے اور چاہتے تھے کہ اس ضمن میں امت کی مناسب رہنمائی فرما دیں۔ آپ کے ارشادات سے یہ حقیقت بھی صاف طور پر مترشح ہوتی ہے کہ اگرچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضورؐ کی نظرِ مبارک میں منصبِ خلافت کے لیے اہل ترین تھے اور آپؐ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہی خلیفۂ اول بنیں، لیکن ان جملہ امور کے باوجود آپ نے اپنے جانشین کے لیے نامزدگی (NOMINATION) کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ آنحضورؐ کا وصال ایک عظیم سانحہ تھا اور اس کے بعد خلیفہ کا تقرر امت کے لیے ایک سنگین ذمہ داری اور آزمائش تھی۔ اس مسئلے میں اختلافِ رائے کا پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا جس کے

اثرات اب تک امت میں چلے آ رہے ہیں۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتی رائے قائم کر لینے کے باوجود صحابہؓ کرام کے سامنے اُسے ایک باقاعدہ عہد، وصیت یا تجویز کے طور پر پیش نہیں فرمایا تاکہ قدیم زمانہ سے دنیا بھر میں ولی عہد مقرر کرنے کا جو طریقہ رائج و متوارث چلا آ رہا تھا، اس پر کاری ضرب لگے اور امتِ مسلمہ اپنی ذمہ داری پر انتخابِ امیر کے جمہوری و معیاری طریق کو اختیار کرے۔ صحاح ستہ میں اس مسئلے سے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں جن میں سے ایک کا ضروری حصہ میں بخاری، کتاب الطب والمرضیٰ سے یہاں پیش کرتا ہوں اس حدیث میں مذکور ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر شدتِ مرض طاری ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا:

لقد هممت او اردت ان ارسل الى ابى بكر وابنه واعهد ان يقول القائلون او يتمنى المتمنون ثم قلت يأبى الله ويدفع المؤمنون او يدفع الله ويأبى المؤمنون۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ میں ابوبکر اور ان کے بیٹے کو بلواؤں اور ان کے حق میں ولایتِ عہد کر دوں، مبادا کہ (بعد میں) معترضین اعتراض کریں یا تمنا کرنے والے تمنا کریں پھر میں نے جی میں کہا کہ اللہ ان چیزوں کو روک دے گا اور مومنین ان کا دفعیہ کریں گے۔ یا دوسرے الفاظ میں اللہ دفعیہ کر دے گا اور مومنین ابا کریں گے۔

یہ حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بخاری اور دیگر کتبِ صحاح کے متعدد مقامات پر وارد ہے۔ اس کا لفظ "المؤمنون" قطعی طور پر ثابت کر رہا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب جمہور مسلمین کی آزاد مرضی سے ہونا چاہیے اور اسلام میں انتخابِ امیر کے لیے مثالی و معیاری اور افضل و اولیٰ طریقہ یہی ہے۔ چنانچہ حضورؐ کے اس منشا کو امت نے ٹھیک ٹھیک پورا کیا اور انہی حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا جنہیں حضورؐ پسند فرماتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ تھے جن کا تقرر و استخلاف بلاشبہ حضرت ابوبکرؓ کی تجویز کے مطابق عمل میں لایا گیا تھا اور اسی سے بعض حضرات یزید کی ولی عہدی اور بعد کی نسلی و خاندانی حکمرانی کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ایک پر دوسری صورت کو قیاس کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ دونوں میں فرق و امتیاز کے متعدد پہلو بالکل بیّن اور نمایاں ہیں۔ مثلاً پہلا فرق یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں کوئی ولی عہد مقرر کر کے اس کی بیعت نہیں لی بلکہ ان کو اپنا جانشین تجویز کرنے کا خیال اس وقت آیا جبکہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اپنے آخری ایامِ مرض میں کئی

روز تک آپ مسجد میں نماز کے لیے بھی تشریف نہ لے جا سکے اور جس وقت آپ نے حضرت عثمانؓ کو وصیت لکھوانی شروع کی تھی اس وقت آپ اتنے ضعیف و نحیف ہو چکے تھے کہ املاء کراتے کراتے آپ کچھ دیر کے لیے بیہوش ہو گئے۔ اس کے برعکس یزید کی ولی عہدی کی تحریک اور مہم کا آغاز حضرت امیر معاویہؓ کی وفات سے چار سال بلکہ اس سے بھی قبل (۵۱ھ میں) ہو چکا تھا۔ یہ تحریک صرف شام تک محدود نہ تھی بلکہ مروان اور زیاد وغیرہ نے اسے حرمین، بصرے، کوفے میں پوری سرگرمی سے شروع کر رکھا تھا اور تمام لوگوں سے باقاعدہ بیعت لی جا رہی تھی۔ اسی صورتِ حال کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمر جیسے محتاط اور مرنجاں مرنج انسان نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک وقت میں دو بیعتوں کا قلادہ اپنی گردن میں نہیں ڈال سکتا۔ البتہ امیر معاویہؓ کے بعد جو بھی خلیفہ تسلیم کر لیا جائے گا، میں اس کی بیعت کر لوں گا۔

دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے تحریر لکھوانے سے چند روز پہلے اربابِ حل و عقد اور اصحابِ شوریٰ سے پوری طرح مشورہ کر لیا تھا۔ چنانچہ ابن سعد صاحبِ طبقات نے آپ کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر میں ذکر وصیة ابی بکر کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ آپ نے حضرات عبدالرحمٰن بن عوفؓ، عثمانؓ، سعید بن زیدؓ، ابو الاعورؓ، اُسید بن حضیرؓ اور متعدد دیگر مہاجرین و انصار سے مشورہ لیا اور سب نے حضرت عمرؓ کے حق میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ پھر بعض لوگوں نے جب حضرت عمرؓ کی سختی کا ذکر کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں اپنے اللہ سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بہترین آدمی کو تجویز کیا ہے (بعض دوسری روایات میں ہے کہ عمر میری نرمی کے بل پر سخت ہو جاتے تھے، اب جب میری جگہ خود بوجھ اُٹھائیں گے تو نرم ہو جائیں گے) پھر مجمع عام میں تحریر پڑھ کر سنائی گئی اور لوگوں نے کسی دباؤ اور جبر کے بغیر برضا و رغبت اس پر اپنی منظوری کا اظہار کر دیا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد میں شوریٰ کا وجود اور اہلِ حل و عقد کا ادارہ عملاً ختم ہو چکا تھا اور یزید کی ولی عہدی کا معاملہ جس طرح طے کیا گیا وہ حضرت ابوبکرؓ کی وصیت سے قطعی طور پر مختلف تھا جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔

تیسری بات جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے مابین خاندانی قرابت کا کوئی تعلق نہیں تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اپنی وصیت کے ساتھ اس پہلو کی طرف خصوصی اشارہ فرما دیا تھا تاکہ اعتراض و تہمت کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ امام ابن جریر اپنی تاریخ (جلد ۲، ص ۶۱۸) میں فرماتے ہیں:

اشرف ابو بکر علی الناس من کنیفه و ۔۔۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریچے میں سے لوگوں کی طرف جھانکا

أسماء ابنة عميس ممسكته وهو يقول أترضون بمن أستخلف عليكم؟ فإني والله ما ألوت من جهد الرأي ولا وليت ذا قرابة وإني قد استخلفت عمر بن الخطاب فاسمعوا له وأطيعوا فقالوا سمعنا وأطعنا۔

جبکہ (آپ کی اہلیہ، حضرت اسماء بنت عمیس نے آپ کو تھام رکھا تھا۔ آپ فرما رہے تھے کہ کیا تم لوگ میرے جانشین پر راضی ہو؟ خدا کی قسم میں نے غور و خوض میں کمی نہیں کی اور میں نے اپنے کسی رشتہ دار کو ولایت نہیں سونپی۔ میں نے عمرؓ بن خطاب کو خلیفہ تجویز کیا ہے پس سنو اور مانو۔ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔

اس کے برخلاف امیر معاویہؓ نے اپنے قریب ترین عزیز یعنی خود اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا کر ایک ایسی مثال قائم کی جو پہلے موجود نہ تھی، لیکن جو بعد والوں کے لیے دائمی طور پر ایک نظیر اور دلیل بن کر رہی۔ ابن اثیر فرماتے ہیں: معاوية أول خليفة بايع لولده في الاسلام (معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے اسلام میں اپنے بیٹے کے لیے بیعت لی، الکامل ج ۳ ص ۲۶۳)۔ اس کے بعد مسلمانوں میں بیعت کا انتخابی اور شورائی طریقہ بالکل معدوم ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک حکمران نے اپنے بعد علی الترتیب دو دو، تین تین ولی عہد مقرر کرنے شروع کر دیئے جن میں سے بعض نابالغ بلکہ ماں کے پیٹ میں ہوتے تھے اور ان کے حق میں زبردستی بیعت لی جاتی تھی پھر بیعت کے فارمولوں میں بیعت کرنے والے سے یہ الفاظ کہلوائے جاتے تھے کہ اگر میں بیعت فسخ کروں گا تو میری بیوی پر طلاق مغلظ وارد ہو گی۔ یہی بیعتِ مکرہ اور طلاقِ مکرہ تھی جس کے خلاف امام مالکؒ نے اپنی جان پر کھیلتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی تھی اور فرمایا تھا کہ یہ کوئی شے نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کی باری آتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق بعض اوقات یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے استخلاف کے معاملے میں اپنے دونوں پیش روؤں کے بین بین ایک تیسرا مختلف طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ آپ نے کسی فردِ واحد و متعین کو جانشین تجویز کرنے کے بجائے ایک شوریٰ یا انتخابی کونسل تشکیل کر دی تاکہ وہ خلیفہ کا نام تجویز کر کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو حضرت عمرؓ کا طریقِ استخلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے زیادہ مشابہ ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب الاستخلاف میں حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا تو لوگوں نے آپ کو جانشین مقرر کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے متردد ہو کر فرمایا کہ اگر میں جانشین تجویز کروں تو یہ بھی ایسے شخص کا کام ہے جو مجھ سے بہتر تھا (یعنی حضرت ابوبکرؓ) اور اگر میں تمہیں اسی طرح چھوڑ دوں تو ایسا عمل بھی انہوںؓ نے فرمایا تھا، جو مجھ سے بہتر تھے (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم)۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جو

خود اپنے والدِ ماجد کا اندازِ بیان دیکھ رہے تھے فرماتے ہیں:

فعرفت انه حين ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم غير مستخلف	میں نے جان لیا کہ جب آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کر رہے ہیں تو پھر آپ کسی فردِ واحد کو خلیفہ تجویز نہیں کریں گے۔

اس کے معاً بعد مسلم کی دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت حفصہؓ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد کسی کو جانشین نہیں بنا رہے" حضرت ابن عمرؓ نے جواب دیا کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ وہ فرمانے لگیں کہ وہ ایسا ہی کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ نے قسم اٹھائی کہ وہ اس معاملے میں حضرت عمرؓ سے بات کریں گے۔ ایک دن تو حضرت ابن عمرؓ بات کی ہمت نہ کر سکے مگر دوسرے روز آپ نے عرض کیا کہ "لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ کسی کو جانشین نہیں تجویز کر رہے۔ اگر آپ کا کوئی چرواہا ہو اور وہ اپنے گلے کو اس کے حال پر چھوڑ کر آجائے تو آپ دیکھ لیں گے کہ اس نے گلہ ضائع کر دیا۔ مسلمانوں کی نگہبانی کا معاملہ تو شدید تر ہے" حضرت عمرؓ نے اتفاق کیا، کچھ دیر اپنا سر ٹیکے رہے، پھر حضرت ابن عمرؓ کی طرف متوجہ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا ذکر کرتے ہوئے وہی کچھ فرمایا جو اوپر کی روایت میں مذکور ہے۔ اس پر حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

فعلمت انه لم يكن ليعدل برسول الله صلى الله عليه وسلم احداً وانه غير مستخلف	پس مجھے معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ کسی کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر جاننے والے نہیں ہیں اور آپ کسی کو خلیفہ نہیں بنائیں گے۔

ان روایات اور بالخصوص حضرت ابن عمرؓ کی تشریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس معاملے میں حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کو اپنے سامنے رکھا ہے اور شخصِ متعین کے استخلاف سے اسی بنا پر اجتناب کیا ہے۔ البتہ آپ نے خلافت کے لیے نام تجویز کرنے کا کام ایسے اصحاب کے سپرد کر دیا جو عشرۂ مبشرہ میں شامل تھے اور اسلامی معاشرے کے کلہاتے سر سَبَد اور سربر آوردہ ترین اشخاص شمار ہوتے تھے۔ عشرۂ مبشرہ میں سے دو (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت ابو عبیدہؓ) جنت کے مکین ہو چکے تھے، تیسرے خود (حضرت عمرؓ) جنت جانے کے لیے پا بہ رکاب تھے۔ باقی سات اصحاب بقیدِ حیات تھے جن میں سے چھ کو آپ نے انتخابی بورڈ کا رکن بنا دیا مگر ساتویں (حضرت سعیدؓ ابن زید) کو آپ نے مستثنیٰ کر دیا، صرف

اس بنا پر کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھے، ورنہ وہ حضرت عمرؓ سے بھی زیادہ قدیم الاسلام اور سابق الایمان تھے۔ یہ فقط میرا ہی قیاس نہیں ہے، بلکہ متعدد علمائے سلف نے یہی لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انہیں بربنائے تورّع و تقویٰ الگ رکھا کیونکہ وہ اُن کے قرابت دار تھے۔ صحیح مسلم کی جن روایات کو اُوپر نقل کیا گیا ہے، اُن سے ملتی جلتی ایک روایت مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب نہی من اکل الثوم میں بھی موجود ہے جس میں حضرت عمرؓ کے ایک خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر یہ سمجھی گئی تھی کہ آپ کی موت کا وقت قریب ہے۔ آپ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ مجھے جانشین بنانے کے لیے کہتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کو ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اس حدیث کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

الستۃ عثمان وعلی وطلحۃ والزبیر وسعد بن ابی وقاص وعبد الرحمٰن بن عوف ولم یدخل سعید بن زید معھم وان کان من العشرۃ لانہ من اقاربہ فتورع عن ادخالہ کما تورع عن ادخال ابنہ عبد اللہ رضی اللہ عنھم۔

جن چھ اصحاب کے نام حضرت عمرؓ نے تجویز کیے تھے، وہ عثمان، علی، طلحہ، زبیر، سعد ابن ابی وقاص اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم تھے اور انہوں نے ان میں حضرت سعید بن زید کو شامل نہیں کیا حالانکہ وہ بھی عشرۂ بشرہ میں سے تھے، کیونکہ وہ ان کے اقارب میں سے تھے پس آپ نے انہیں شوریٰ میں داخل نہیں فرمایا جیسا کہ آپ نے اپنے صاحبزادے حضرت عبدُاللہ کو بھی نہیں شریک کیا۔

اسی طرح بخاری، کتاب الحدود والمحاربین، باب رجم الحبلیٰ من الزنا میں ایک مفصل حدیث وارد ہے کہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ میں عمرؓ کے بعد فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ میں ایسے لوگوں کو سخت تنبیہ کروں گا۔ پھر فرمایا:

ھٰؤلاءِ الذین یریدون ان یّغصبوھُم امورھم۔۔۔ ولیس منکم من تقطع الاعناق الیہ مثل ابی بکر من بایع رجلاً غیر مشورۃ من المسلمین فلا یبایع ھو ولا الذی بایعہ تغرۃ ان یُقتلا۔

یہ وہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ عامۃ الناس کے حقوق غصب کریں۔۔۔ تم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو ابوبکر کی طرح مرجع عوام ہو۔ جس نے بھی مسلمانوں سے مشورے کیے بغیر بیعت کی، اس بیعت کرنے کرانے والے کا فعل قابلِ قبول نہیں ہے، بلکہ وہ دونوں اپنے آپ کو قتل

کے لیے پیش کر رہے ہیں۔

بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت ابن عمرؓ کو بھی انتخابی کونسل میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ مبصر کی حیثیت سے موجود رہیں مگر خلافت میں ان کا کوئی حصّہ نہ ہوگا۔ میرے خاندان میں اگر عمرؓ برابر سرابر چھوٹ جائے تو غنیمت ہے۔ بخاری، فضائل اصحاب میں حضرت عمرؓ کا ارشاد یوں نقل ہوا ہے :

يشهدكم عبد الله بن عمر وليس له من الامر شيئ ۔

تمہاری مجلس میں عبداللہ بن عمرؓ حاضر تو رہیں گے مگر امارت میں سے انہیں کچھ نہ ملے گا۔

اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں :

اما سعيد بن زيد فهو ابن عم عمر فلم يسمه عمر فيهم مبالغة في التبرى من الامر

سعیدؓ بن زید حضرت عمر کے چچا زاد بھائی تھے، پس عمرؓ نے ان کا نام نہ لیا۔ یہ امارت کی ذمّہ داری سے برأت میں مبالغہ و شدت کی بنا پر تھا۔

اسی مقام پر المدائنی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے :

عدّ عمر سعيد بن زيد فيمن توفى النبي صلى الله عليه وسلم وهو عنهم راض الا انه استثناه من اهل الشورى لقرابته منه ۔

حضرت عمرؓ نے حضرت سعید بن زید کو ان اصحاب میں شمار کیا جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بوقت وصال راضی تھے مگر حضرت عمرؓ نے انہیں اہلِ شوریٰ سے مستثنیٰ کر دیا۔ کیونکہ وہ آپ کے رشتہ دار تھے۔

امام ابن تیمیہؒ، منہاج السنۃ، جلد ۳، ص ۱۶۸ پر فرماتے ہیں :

وعمر قد اخرج من الامر ابنه ولم يدخل في الامر ابن عمه سعيد بن زيد وهو احد العشرة وهم من قبيلة بني عدي ۔

اور حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہ اور اپنے عم زاد سعید بن زید کو امیدوارِ امارت سے خارج کر دیا حالانکہ سعیدؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قبیلۂ بنی عدی کے افراد تھے۔

اس کے متصلاً بعد ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قبیلے میں سے کسی کے سپرد کوئی عہدہ نہیں کیا۔ صرف ایک مرتبہ ایسا کیا مگر بعد میں اس والی کو بھی معزول کر دیا۔ یہی بات اس کتاب کے صفحہ ۱۳۰، ج ۴ پر بیان

کی گئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں نے اپنی زندگی میں اپنے کسی عزیز کو منصب نہیں سونپا، نہ اُسے اپنے بعد جانشین بنایا، حالانکہ ان کی اولاد و اقارب میں فضلائے صحابہ موجود تھے۔

حضرت عمرؓ نے جو انتخابی شوریٰ مقرر کی تھی اس کے ارکان نے باہمی گفت و شنید کے بعد خلیفہ تجویز کرنے کا کام حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو تفویض کر دیا تھا۔ تاریخ طبری اور دوسری کتابوں میں جو تفصیلات درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ رائے عام کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ آپ نے گھروں میں جا کر پردہ نشین خواتین تک سے مشورہ لیا۔ مدینے کے باشندوں، طالب علموں اور باہر سے آتے جاتے حاجیوں کی رائے معلوم کی۔ آخر کار انہیں اندازہ ہوا کہ لوگ حضرت عثمانؓ کی طرف زیادہ جھکاؤ رکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی کے ہاتھ پر بیعت عام ہوئی۔

حضرت عثمانؓ اپنے خاندان بنو امیہ کے حق میں فیاض تھے۔ آپ کا یہ قول مُسند احمد اور دوسری کتابوں میں منقول ہے کہ اگر میرے پاس جنت کی کنجی ہو تو میں اپنے خاندان کے آخری فرد تک کو دے دیتا کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے[1]۔ آپ کے خاندان کے بعض افراد نے محاصرے میں آخر دم تک آپ کا ساتھ دیا۔ مگر اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے بھی اپنے خاندان کے کسی فرد کے حق میں استخلاف کی وصیت نہیں فرمائی۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بعض صحابۂ کرامؓ حضرت علیؓ کے ہاں جمع ہوتے اور ان سے بیعت کرنی چاہی مگر حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔ جب آپ سے بار بار تقاضا کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جب تک اہلِ شوریٰ اور اہلِ بدر میری خلافت پر اتفاق کا اظہار نہ کریں، اس وقت تک میری خلافت منعقد نہیں ہو سکتی۔ تاریخ طبری ج ۳، ص ۴۵۰ میں آپ کا یہ قول بھی منقول ہے:

فان بیعتی لا تکون خفیا ولا تکون الا عن رضا المسلمین۔

میری بیعت مخفی طریق پر نہیں ہو سکتی، اس کے لیے مسلمانوں کی رضائے عام لازم ہے۔

پھر آپ نے سب لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع ہونے کا مشورہ دیا اور مہاجرین و انصار صحابہؓ کی اکثریت نے آپ سے بیعتِ خلافت کی۔

حضرت علیؓ کی شہادت کے موقع پر جب آپ کی وفات کا وقت آپہنچا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا

---

[1] مُسند احمد، مرویات عثمان میں ہے:

قال عثمان، ولو ان بیدی مفاتیح الجنۃ لاعطیتہا بنی امیۃ حتی یدخلوا من عند آخرھم۔

آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حضرت حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کی جائے؟ آپ نے جو جواب دیا وہ طبری (ج ۲، ص ۱۱۲) میں درجِ ذیل الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

ما آمرکم ولا انھاکم - انتم ابصر — میں نہ تمہیں اس بارے میں کوئی حکم دیتا ہوں، نہ منع کرتا ہوں۔ تم خود مجھ سے بہتر فیصلہ کر سکتے ہو

چنانچہ حضرت علیؓ کے بعد جن لوگوں نے حضرت حسنؓ سے بیعت کی تھی اور جو حضرت معاویہؓ کے خلاف جنگ کے لیے نکلے تھے، ان سب نے حضرت حسنؓ کو بطیب خاطر اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ منتخب کیا تھا، اس میں حضرت علیؓ کی کسی خواہش یا ہدایت کو کوئی دخل نہ تھا۔

یہ ہے رئیسِ مملکتِ اسلامی کے تقررؒ کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کا تعامل اور صحابہ کرام کا اجماعی طرزِ عمل۔ اس مستند دستوری رواج سے جو بات قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ کہ خلیفۃ المسلمین کا انتخاب عوام الناس کی مرضی پر موقوف و منحصر ہے اور کسی شخص کا بزور خلیفہ بننے کی کوشش کرنا اور پھر اپنے کسی قریبی عزیز کے حق میں جانشینی کا فیصلہ کر کے اپنی زندگی میں اس کی بیعت لے لینا کوئی مستحسن اور پسندیدہ فعل نہیں ہے علماء کا اجماع اگر ہوا ہے تو اس بات پر ہوا ہے کہ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے اور اس کو بدلنے کی کوشش موجبِ فتنہ ہوتی نظر آئے تو اسے برداشت کر لینا چاہیے، اور اس طرح بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ مگر اس بات پر اجماع ہرگز نہیں ہوا ہے کہ اسلام میں یہ بالکل جائز و مباح طریقہ ہے اور خلافت خواہ شوریٰ اور انتخاب سے ہو، یا اس دوسرے طریقہ پر، دونوں اسلام کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث آگے چل کر ہو گی۔

تصحیح نسبت کی بحث اس اصولی و تمہیدی کلام کے بعد اب میں مولانا مودودی کی وہ عبارت نقل کرتا ہوں جسے مولانا عثمانی صاحب نے سب سے پہلے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ وہ عبارت "خلافت و ملوکیت" ص ۱۰۵ پر ان الفاظ میں درج ہے:

"یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہؓ بن شعبہ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اس طرح امتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔"

اس پر مولانا محمد تقی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ "جمہور امت کے محقق علماء ہمیشہ سے یہ تو کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہؓ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا مگر حضرت معاویہؓ کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا"۔ اس کے جواب میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ مولانا عثمانی نے مولانا مودودی کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے محتاط الفاظ اور ملائم اندازِ بیان کو خواہ مخواہ سخت اور ناگوار الفاظ میں بدل دیا ہے۔ کسی کام کا صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا یا اس کی نیت کا متہم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں۔ اسی طرح کسی فرد کا ذاتی مفاد سے اپیل کرنا اور کسی فرد کا مفاد پرست ہو جانا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ میں کہوں کہ بعض صحابہ کرام سے سرقہ، شربِ خمر یا زنا کا صدور بھی ہوا ہے اور عثمانی صاحب میرا قول یوں نقل کر دیں کہ صحابہ کرام چور، شرابی، زانی اور عیش پرست تھے۔ یا عثمانی صاحب یہ فرمائیں کہ مسلمانوں سے شرک و بدعت کا صدور ہو رہا ہے اور میں ان کی بات کو یوں نقل کروں کہ مسلمان عام طور پر مشرک اور مبتدع بن چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔

تاہم اگر جذبے اور نیت کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے اور کسی کام کے صحیح جذبے پر مبنی نہ ہونے کا مطلب تصحیح نیت کا فقدان ہی لے لیا جائے تب بھی ایک بنیادی سوال جو اس ضمن میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ نیت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کا لحاظ و اعتبار ہر انسانی فعل میں ہے یا کچھ خاص قسم کے افعال ہیں جن میں نیت کی صحت و عدمِ صحت معتبر ہے اور جن میں نیت کے فساد و صلاح کے مختلف عواقب و اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی حد تک اس مسئلے پر غور کیا ہے اور محدثین نے انما الاعمال بالنیات اور لکل امرءٍ ما نویٰ وغیرہ احادیث کی تشریح میں جو کچھ فرمایا ہے، اس کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس معاملے میں جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ نیت کے وجود و عدم یا صحت و سقم کا سوال صرف اُن اعمال کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو عبادات و تقربات سے متعلق ہوں یا کم از کم شریعت کے اوامر و نواہی کی تعمیل کرتے ہوئے انجام پذیر ہوں۔ مثال کے طور پر کوئی شخص اگر نماز پڑھے یا زکوٰۃ دے یا حج کرے یا جہاد فی سبیل اللہ میں جانی و مالی قربانی دے تو ان میں نیت کا موجود یا مفقود ہونا اور اس کا صحیح یا غلط ہونا بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور ہر پہلو سے قابلِ اعتبار

رہے، کیونکہ ایسے افعال میں نیت کی اچھائی یا برائی سے آسمان و زمین کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو فعل جو نظر بظاہر یکساں ہوں، ان میں سے ایک پر جنت واجب ہو اور دوسرا بالکل اکارت جائے، بلکہ اُلٹا موجبِ مواخذہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان افعال کے معاملے میں ہمیں حسنِ ظن کی تلقین کی گئی ہے اور زیادہ قیاس آرائی سے روکا گیا ہے، اگرچہ صریح شواہد و قرائن کی بنا پر نیت کو زیرِ بحث لانا قطعاً ممنوع بھی نہیں ہے۔ وہ امور جو عبادات کی قبیل سے نہیں ہیں اور جن کا مشروع اور مامور بہ ہونا کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے، بلکہ جو شریعت کی رُو سے غلط یا غیر مستحسن قرار پاتے ہیں، ان میں نیت یا جذبے کے صحیح یا غیر صحیح ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس طرح کے افعال جب زیرِ بحث آتے ہیں تو ناگزیر طور پر وہ ارادہ اور جذبہ بھی زیرِ بحث آجاتا ہے جس کے تحت وہ افعال سرانجام پاتے ہیں۔ یہ امر بالکل ظاہر اور بدیہی ہے کہ اس طرح کے محلِّ نظر اعمال جب موضوعِ سخن بنتے ہیں تو ان کے حُسن و قُبح پر بحث کے دوران میں وہ جذبہ و مُحرّک بھی لامحالہ کسی نہ کسی حد تک بیان میں آہی جاتا ہے جو ان میں کارفرما ہوتا ہے اور جو عملی رویّے سے صاف طور پر مترشح ہو رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کے اعمال میں اگر جذبات و محرکات کا ذکر آجائے تو ذکر کرنے والے کا مُنہ یہ کہہ کر بند نہیں کیا جاسکتا کہ تم نیت پر حملہ کر رہے ہو جس کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اگر غلط فعل کو غلط جذبے پر مبنی قرار دینے کا نام "نیت پر حملہ" ہے اور گناہ ہے تو پھر کسی دینی، علمی یا تاریخی موضوع پر کلام کرنے والا شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو اس سے بچ سکا ہو۔ مولانا محمد تقی صاحب عثمانی اب تک جو کچھ سپردِ قلم کرتے رہے ہیں اگر اس پر ایک نگاہِ بازگشت ڈال لیں تو انہیں اس میں بھی اس چیز کے متعدد نمونے مل جائیں گے جسے وہ "نیتوں پر حملہ" قرار دے کر ممنوع ٹھیرا رہے ہیں۔ انسانی فعل اور مشینی حرکت میں آخر کچھ تو فرق ہوتا ہے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فعل نامحمود بالعموم جذبۂ نامحمود ہی کا ثمرہ ہوتا ہے۔

اس سے پہلے میں شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے اقوال نقل کر چکا ہوں جن میں انہوں نے فرمایا ہے کہ امیر معاویہؓ کی بعض کارروائیاں خاندانی عصبیت سے مُبرّا نہ تھیں۔ حضرت سعدؓ بن عُبادہ اور ابو سفیانؓ کے متعلق بھی میں ابن تیمیہؒ کے اقوال درج کر چکا ہوں اور بہت سے دیگر اقوالِ بزرگانِ سلف کے پیش کیے جاسکتے ہیں جن میں انہوں نے بعض صحابہ کرام کے رویّے پر ایسے الفاظ میں تنقید کی ہے جن کی زد جذبات و محرّکات پر بھی لازماً پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر حافظ ابن عساکرؒ، حضرت فُضیلؒ بن عیاض کا ایک قول روایت کرتے

ہیں جسے ابن کثیرؒ نے البدایہ جلد ۸ ص ۱۴۰ پر بھی نقل کیا ہے۔ قول یہ ہے:

معاویۃ من الصحابۃ، من العلماء الکبار ولکن ابتلی بحب الدنیا۔

معاویہؓ صحابی اور علماء کبار میں سے ہیں لیکن وہ حبِ دنیا میں مبتلا ہو گئے۔

اب مولانا عثمانی اگر چاہیں تو فرما سکتے ہیں کہ یہ امیر معاویہؓ پر دنیا پرستی کا الزام ہے اور ان کی نیت پر حملہ ہے جس کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ لیکن عثمانی صاحب کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ حضرت فُضَیل ایک طرف ایسے صاحبِ تقویٰ و تورّع تھے کہ وہ صوفیائے کرام کے امام شمار کیے جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ اتنے ثقہ اور صادق القول ہیں کہ صحیحین، سُنن اور مُسندِ شافعیؒ سب میں ان کی روایات موجود ہیں۔

مولانا وحید الزمان صاحب حیدر آبادی نے تیسیر الباری (ترجمہ و تشریح البخاری) کے متعدد مقامات پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا دل اہلِ بیت سے صاف نہ تھا جس طرح شاہ عبدالعزیزؒ نے لکھا ہے کہ: "حرکاتِ اُو خالی از شائبہ نفسانی نبود"۔ یہ الفاظ بظاہر بہت سخت ہیں اور ممکن ہے کہ مولانا محمد تقی صاحب ان کو بھی "نیت پر حملہ" قرار دیں۔ لیکن ان الفاظ کو نیت پر حملہ کہہ کر ان کا زبان و قلم سے صدور ممنوع سمجھنا اس وجہ سے درست نہیں کہ تاریخ و حدیث کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے مذکور ہیں جو اسی صورتِ حال پر صاف صاف دلالت کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ و آلِ علیؓ پر سب و شتم ہی کے مسئلے کو لیجیے۔ یہ مذموم طریقہ جس طرح حضرت علیؓ کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد تک جاری رہا اور حضرت حسنؓ اور حسینؓ کے مدینہ منتقل ہو جانے پر جس طرح امیر معاویہؓ کا گورنر مروان ان کے رُو در رُو خطبوں میں ان پر لعن طعن کرتا تھا، اس کے بعد آخر دلوں کی صفائی کیسے باقی رہ سکتی تھی؟ پھر یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری کے بعد بھی ان کی طرف سے امیر معاویہؓ اپنی طبیعت میں خلش محسوس کرتے تھے جو امام حسنؓ کی وفات ہی پر رفع ہوئی۔ ابو حنیفہؒ دینوری الاخبار الطوال ص ۲۲۲ پر لکھتے ہیں۔

وانتهیٰ خبر وفاۃ الحسن الی معاویۃ، کتب بہ الیہ عاملہ علی المدینۃ مروان فارسل الی ابن عباس وکان عندہ بالشام فعزاہ واظھر الشماتۃ بموتہ فقال لہ ابن عباس لا تشتمن بموتہ فواللہ لا تلبث بعدہ

حضرت حسنؓ کی وفات کی خبر امیر معاویہؓ کے عاملِ مدینہ مروان نے ان تک پہنچائی۔ انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کو بلایا جو ان کے پاس شام میں آئے ہوئے تھے پس امیر معاویہؓ نے ان سے اظہارِ ہمدردی کیا اور امام حسنؓ کی وفات پر خوشی ظاہر کی۔ اس پر ابن عباسؓ نے ان سے

الّا قلیلاً۔ کہا کہ آپ ان کی موت پر خوش نہ ہوں۔ خدا کی قسم آپ بھی ان کے بعد زیادہ دیر زندہ نہ رہیں گے۔

اس کے بعد سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب فی جلود النمور کی درج حدیث ملاحظہ ہو:

وفد المقدام بن معدیکرب الی معاویۃ بن ابی سفیان فقال معاویۃ للمقدام اعلمت ان الحسن بن علی توفی فرجّع المقدام فقال له فلان اتعدّھا مصیبۃ۔ فقال له ولِمَ لا اراھا مصیبۃ وقد وضعه رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی حجرہ فقال ھٰذا منی وحسین من علیؓ۔ فقال الاسدی جمرۃ اطفاھا اللہ۔	مقدامؓ بن معدیکرب حضرت معاویہؓ کے پاس آئے تو حضرت معاویہؓ نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہوا ہے کہ حسنؓ فوت ہو گئے ہیں؟ مقدامؓ نے کہا انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔ ایک شخص (مراد امیر معاویہؓ ہیں) نے کہا کہ کیا آپ اسے ایک مصیبت قرار دے رہے ہیں؟ مقدام کہنے لگے کہ میں ان کی وفات کو کیوں مصیبت نہ سمجھوں حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی گود میں بٹھایا اور فرمایا کہ یہ میرا ہے اور حسینؓ علیؓ کا ہے۔ قبیلہ بنو اسد کے فرد نے جو حضرت مقدام کے ہمراہ تھا، کہا کہ حسنؓ ایک انگارہ تھا جسے اللہ نے بجھا دیا۔

اس روایت میں جہاں فلاں کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں مُسند احمد میں معاویہ کا لفظ مروی ہے، جیسا کہ مولانا شمس الحق صاحبِ عون المعبود نے تصریح کر دی ہے۔ اس روایت کی تشریح میں مولانا موصوف فرماتے ہیں:

والعجب کل العجب من معاویۃ فانه ما عرف قدر اھل البیت حتی قال ما قال۔ فان موت مثل الحسن بن علی رضی اللہ عنه فی اعظم المصائب وجزی اللہ المقدام ورضی عنه فانه ما سکت عن تکلم الحق حتی اظھرہ وھکذا شان المؤمن الکامل المخلص .... فقال الاسدی طلبا لرضاء معاویۃ وتقربًا الیه۔ انما قال الاسدی ذالك القول الشدید السخیف لان معاویۃ رضی	امیر معاویہؓ کے اس قول پر انتہائی تعجب ہے۔ انہوں نے اہلِ بیت کی قدر نہ پہچانی حتیٰ کہ ایسی بات کہہ دی۔ حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی وفات یقیناً بہت بڑی مصیبت تھی اور اللہ حضرت مقدام کو جزائے خیر دے اور ان سے راضی ہو کہ انہوں نے کلمۂ حق ادا کرنے میں خاموشی اختیار نہ کی اور اسے علانیہ کہہ دیا۔ مومن کامل و مخلص کی یہی شان ہے۔ بنو اسد کے شخص نے جو کچھ کہا وہ معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے کے لیے تھا۔ اُس نے یہ سخت گھٹیا بات اس وجہ سے

الله عنه كان يخاف على نفسه من زوال الخلافة

امیر معاویہؓ کے سامنے کہی تھی کہ (امام حسنؓ کی موجودگی میں) امیر معاویہؓ کو اپنی خلافت کے زوال کا خوف تھا۔

یہی الفاظ مولانا خلیل احمد صاحب نے بذل المجہود شرح سنن ابی داؤد میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے درج فرمائے ہیں۔ وہ بھی لکھتے ہیں:

فقال الاسدی طلباً لرضاء معاوية وتقرباً اليه فقال المقدام حين سمع ما قال فی ابن بنت رسول الله صلی الله عليه وسلم لم اعاة معاوية اما انا فلا ابرح اليوم حتى اغيظك واسمعك فيه ما تكره كما اسمعتنی ما اكره۔

اسدی نے یہ بات معاویہؓ کی رضا اور تقرب حاصل کرنے کے لیے کہی تھی، جب حضرت مقدامؓ نے اس شخص کی بات سنی جو اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے امیر معاویہؓ کی خاطرداری کے لیے کہی تھی، تو حضرت مقدامؓ امیر معاویہؓ سے کہنے لگے کہ میں یہاں سے آج ہرگز نہ ہلوں گا جب تک آپ کو غصہ نہ دلاؤں اور آپ کو ایسی بات نہ سناؤں جو آپ کو ناپسند ہو جس طرح کہ آپ نے مجھے ایسی بات سنائی جو مجھے پسند نہیں۔

حدیث میں آگے بیان ہے کہ حضرت مقدامؓ نے حضرت معاویہؓ کو قسم دلا کر پوچھا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کا زیور اور ریشم پہننے سے منع نہیں فرمایا اور خدا کی قسم یہ چیزیں آپ کے گھر کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی شرح میں صاحب عون المعبود فرماتے ہیں:

فان ابناءك ومن تقدر عليه لا يحترزون عن استعمالها وانت لا تنكر عليهم وتطعن فی الحسن۔

آپ کے لڑکے اور گھر کے مرد (یزید وغیرہ) ان اشیاء کے استعمال سے پرہیز نہیں کرتے اور آپ ان پر نکیر نہیں کرتے۔ اور ادھر آپ حضرت حسن پر طعن کرتے ہیں۔

تاریخ و حدیث کی یہ روایات اور ان کی تشریح میں جو کچھ کہا گیا ہے، شاید مدیر "البلاغ" کے نزدیک یہ سب نیتوں پر حملے کے مترادف ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے نیت پر حملے کا نام دے کر شرعاً ممنوع قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ درحقیقت ان میں نیت نہیں بلکہ ایک طرز عمل زیر بحث لایا گیا ہے جو غیر مستحسن اور نامناسب تھا۔ ظاہر ہے کہ جب عمل پسندیدہ نہیں تھا تو جس جذبے یا جس نیت پر یہ عمل مبنی ہوگا، وہ جذبہ اگر ضمناً بحث میں آجائے اور اس جذبے کو غلط یا ناپسندیدہ بھی کہہ دیا جائے تو اس سے کیا قباحت لازم آتی ہے؟ اگر

یہ پابندی لگا دی جائے کہ کسی غلط یا قابلِ اعتراض قول و فعل کی غلطی واضح کرتے ہوئے اُس جذبہ و ارادہ کی جانب مطلقاً کوئی اشارہ ہی نہ ہو جو اس قول و فعل کے پیچھے کارفرما ہے، تو اس کے دوسرے معنی تو یہ ہیں کہ پھر غلطی کو غلطی ہی نہ کہا جائے۔ غلط کام کی عدمِ صحت کو جب بھی بیان کیا جائے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک اس کا محرک بھی آپ سے آپ بیان ہو گا۔ اس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی نے حضرت معاویہؓ یا دوسرے صحابہ کرام کے جس قول و فعل سے بھی کتاب و سنت کی روشنی میں اظہارِ اختلاف کیا ہے مؤدب الفاظ اور محتاط انداز میں کیا ہے۔ براہِ راست ان حضرات کی نیت کو زد میں لاتے ہوئے انہیں "بدنیت یا مفاد پرست" جیسے گستاخانہ القاب سے ہرگز ملقب نہیں کیا۔ یہ مدیرِ "البلاغ" کی صریح دھاندلی ہے کہ وہ عامۃ المسلمین کو متوحش کرنے کے لیے اس طرح کے الفاظ گھڑ کر مولانا مودودی کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر میں مولانا مودودی کی درج ذیل عبارت پیش کرتا ہوں جو انہوں نے خلافت و ملوکیت ص ۳۴۴ پر درج کی ہے:

"جن حضرات نے بھی قاتلینِ عثمانؓ سے بدلہ لینے کے لیے خلیفۂ وقت کے خلاف تلوار اٹھائی ان کا یہ فعل شرعی حیثیت سے بھی درست نہ تھا اور تدبیر کے اعتبار سے بھی غلط تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرہ برابر تأمل نہیں ہے کہ انہوں نے یہ غلطی نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے کی تھی مگر میں اسے محض غلطی سمجھتا ہوں۔ اس کو "اجتہادی غلطی" ماننے میں مجھے سخت تأمل ہے۔"

کیا کوئی انصاف پسند اہلِ علم جو خواہ مخواہ سوئے ظن میں مبتلا نہ ہو، یہ کہہ سکتا ہے کہ مولانا مودودی کا یہ موقف حدِ شرع یا حدِ ادب سے متجاوز ہے اور اس قول کا قائل قصداً کسی صحابیٔ رسول کو (معاذ اللہ) بدنیت ثابت کرنا چاہتا ہے یا ان کی عدالت کو مجروح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کیا علمائے اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ صحابہ کرام معصوم عن الخطا ہیں، ان سے کسی غلطی کا صدور سرے سے ممکن ہی نہیں ہے اور ان کے ہر قول و فعل پر اجتہاد کا اطلاق ہوتا ہے؟

(باقی)

دورۂ ترکی کے مشاہدات

از جناب خلیل حامدی صاحب

(۱۰)

[افسوس ہے کہ رباط کی تعلیمی کانفرنس کے فیصلوں کی خاطر پچھلی دو اشاعتوں میں یہ مضمون درج نہیں کیا جا سکا۔ یہ ماہ اکتوبر ۱۹۶۹ء کے بعد کی قسط ہے]

مصطفیٰ کمال کے ایک ساتھی کی ہنگامہ خیز تالیف | شیخ نیشار تونا کو راس کتاب کا راز افشا کرتے ہوئے بتلانے لگے کہ اس کے مصنف کا نام ڈاکٹر رضا نور ہے۔ یہ صاحب مصطفیٰ کمال کے گہرے ساتھیوں میں سے تھے۔ لوزان کانفرنس تک دونوں کی گاڑھی چھنتی رہی۔ مگر جب لوزان کانفرنس میں مصطفیٰ کمال نے اپنے تمام وعدوں اور اعلانات کے برعکس ترکی کو سیکولر ریاست قرار دینے اور مذہب کے خلاف تلوار کشی کا فیصلہ کر لیا تو اس وقت ڈاکٹر رضا نور مصطفیٰ کمال سے متنفر ہو گئے۔ چونکہ ظاہری فضا میں مصطفیٰ کمال کا اچھا خاصا اثر تھا اور اس کے اچھے ساتھی بھی اس کی بعض خوبیوں کی وجہ سے اس کے خطرناک اقدامات تک سے چشم پوشی کر رہے تھے اِس لیے اس کے خلاف کوئی مضبوط محاذ قائم کرنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ ڈاکٹر رضا نور نے لوزان کانفرنس کے بعد مصطفیٰ کمال کے اصل حالات کی چھان بین شروع کر دی۔ اور اس چھان بین کے دوران جو اصل حقائق اُن پر کھلے وہ انہوں نے اِس کتاب میں قلمبند کر دیئے۔ کتاب کا نام ہے "میری زندگی اور میری یادداشتیں"۔ یہ چار جلدوں میں ہے اس کتاب کا اصل مسودہ جو ڈاکٹر رضا نور نے اپنے ہاتھوں سے تحریر کیا تھا برٹش میوزیم میں موجود تھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر رضا نور نے خود اپنے طور پر یہ مسودہ حفاظت کے لیے برٹش میوزیم کی تحویل میں دے دیا ہو۔ مسودے کی پیشانی پر یہ تحریر ہے کہ اس کتاب کو آج سے پچاس سال بعد شائع کیا جائے۔ حال ہی میں ایک صاحب برٹش میوزیم گئے تو اس کتاب پر اُن کی نظر پڑی۔ انہوں نے اس کی مائیکرو فلم حاصل کر لی اور اسے لا کر چھاپ دیا۔

شیخ نیشار اس کتاب کو اپنی الماری میں سے نکال لاتے، اور اس کے مختلف صفحات کا ترجمہ مجھے سنانے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مفصل کتاب نہ صرف ترکی کے اُس دور کی اصل تاریخ پیش کرتی ہے جب خلافت

کا خاتمہ ہو رہا تھا اور سیکولر ترکی کی بنیادیں رکھی جارہی تھیں، بلکہ یہ کتاب حیرت انگیز اور سنسنی خیز انکشافات بھی کرتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب خود ترکی میں چھپ چکی ہے اور کثیر تعداد میں اس کے نسخے پھیل چکے ہیں اور اس پر ابھی تک ترکی حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی ہمارے علم کی حد تک نہیں کی گئی ہے اس لیے اس کے بعض مندرجات کا بیان و ذکر کرنے میں مضائقہ نہیں ہو سکتا۔ اس کتاب میں صاف لکھا ہے کہ مصطفیٰ کمال انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ اس کے صفحہ ۱۶۵ پر مصنف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مصطفیٰ کمال حقیقت میں ترک تھا ہی نہیں۔

میں نے شیخ یشار سے پوچھا کیا فی الواقع یہ کتاب ترکی میں چھپ کر تقسیم ہو رہی ہے؟ موصوف مسکرا کر کہنے لگے یقین کیجیے۔ اس کے دس ہزار نسخے اب تک پھیل چکے ہیں اور صرف ۲-۳ ماہ کے اندر اندر اس کی یہ اشاعت ہوئی ہے۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب بھی ترکی کی تاریخ پر برٹش میوزیم میں موجود ہے، اس کی مائیکرو فلم بھی حاصل کر لی گئی ہے اور وہ بھی عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ شیخ یشار کی گفتگو سے یہ امر صاف جھلک رہا تھا کہ ترکی میں تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہے اور پچھلے چند سالوں تک ترکی پر جن لیڈروں کا رُعب چھایا ہوا تھا اور جس نظام کی پرستش ہو رہی تھی وہ جادو کافور ہو چکا ہے۔ ماضی کی قیادت پر تنقید شروع ہو چکی ہے۔ اگر بیرونی طاقتوں کی دسیسہ کاری اور اندر کے ملحد اور یہود نواز عناصر کا سیاسی اور اقتصادی دباؤ انتہائی حد کو نہ پہنچ رہا ہو تو ترکی مستقبل قریب ہی میں غیر معمولی تبدیلی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

رات کافی گزر گئی۔ شیخ یشار سے اجازت لی جو انہوں نے اس شرط پر دی کہ میں اور صالح اوزجان کل اُن کے ہاں افطاری کریں اور مزید تفصیل کے ساتھ تبادلۂ خیالات کریں۔ شیخ یشار فصیح عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے والد سلطان عبدالحمید ثانی کے زمانے میں سرائے سلطان میں کسی عہدہ پر فائز تھے۔

انقرہ میں مواصلات کا قابلِ تقلید نظام

کڑاکے کی سردی اور نصفِ شب کی بے پناہ تاریکی۔ سڑکوں پر مکمل سکوت۔ سوچا کہ اب کافی دیر پیدل چلنا پڑے گا اور پھر جا کر کہیں سواری ملے گی۔ مگر صالح اوزجان نے سڑک پر آتے ہی کھمبے کا رُخ کیا اور کھمبے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ میں نے اس معنی خیز حرکت کی وجہ دریافت کی۔ مگر شاید وہ میری کمزوری اور پریشانی کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ میری پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے کہنے لگے یہاں کھڑے رہتے ہیں، شاید کوئی ٹیکسی مل جائے۔ میں نے کہا اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے کہ اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ ٹیکسی کے اندر بیٹھ کر کہنے لگے کہ "یہ میری اُس حرکت کا نتیجہ ہے جو کھمبے کا بٹن دبا کر میں نے ابھی کی ہے۔ لاہور میں تو ہمیں ایک مرتبہ دن کو بھی ٹیکسی نہیں ملی تھی۔ مگر

انقرہ میں دیکھیے رات کو بھی بلا تاخیر ٹیکسی مل گئی ہے۔ نئی آبادیوں کے کھمبوں پر لگے ہوئے بٹنوں کو دبا دیجیے ٹیکسی سٹینڈ میں اطلاع ہو جائے گی اور ٹیکسی مقام مطلوب تک فوراً پہنچ جائے گی۔ یہ نظام انقرہ کی تمام نئی آبادیوں میں قائم ہے۔ یہ انقرہ کی حسنات میں سے ایک ہے۔ لاہور کا باشندہ اس نظام پر عش عش کر اٹھا۔

آج ۲۹ رمضان المبارک جمعۃ المبارک کا دن ہے۔ جمعۃ الوداع کی نماز علی بیگ ڈیفرل کی یونیورسٹی میں ادا کی۔ یونیورسٹی میں چھٹی تھی۔ نمازیوں کی غالب اکثریت سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے۔ صالح اوزجان نے بتایا کہ منصوبہ بندی وزارت کے تقریباً تمام بڑے عہدیدار نماز میں موجود ہیں۔ خطیب صاحب نے قیامت کے موضوع پر تقریر کی۔ یہ اندازہ مجھے ان احادیث اور آیات سے ہوا جو انہوں نے بار بار تقریر میں بیان کیں۔ نماز کے بعد صالح صاحب نے اکثر حضرات سے میرا تعارف کرایا۔ یہ سب لوگ خوب محبت، گرمجوشی اور تواضع سے ملے۔ اور یوں محسوس ہوا کہ سب ہی مولانا مودودی مدظلہ العالی سے کسی نہ کسی حد تک واقف ہیں۔ صالح اوزجان سے میں نے دریافت کیا کہ کیا یہ لوگ مولانا محترم اور جماعت سے واقف ہیں؟ بتانے لگے کہ ان حلقوں میں ہم مولانا کی تصانیف (ترکی تراجم) پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس لیے واقفیت نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ صالح صاحب نے بتایا کہ مولانا محترم کی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" اسلامیات کے نصاب میں منظور ہو چکی ہے اور مجھ سے تقاضا ہو رہا ہے کہ میں جلد از جلد اسے چھاپوں[1]۔

عید کی تیاریاں | نماز جمعہ کے بعد صالح اوزجان مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر سنجان چلے گئے جہاں ان کی رہائش ہے۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے آئیں گے تاکہ شیخ یشار کے ہاں افطاری کے لیے جا سکیں۔ میں نے ہوٹل میں یہ وقت گزارنے کے بجائے بازاروں میں گردش شروع کر دی تاکہ انقرہ کی عید کی چہل پہل بھرپور دیکھ لی جائے۔

انقرہ کے بارے میں بار بار یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ یہ شہر ہے تو مسلمانوں کا مگر اسی تضاد سے لبریز ہے جو کراچی، قاہرہ، عمان اور طرابلس میں نظر آتا ہے۔ مسجدوں میں جا کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ حاضرین میں نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی اکثریت ہے۔ بازاروں میں معاملہ بالکل الٹا ہو جاتا ہے۔ عورتوں کے نیم عریاں لباس، نوجوانوں کی آوارہ گردی، مردوں اور عورتوں کا باہوں میں باہیں ڈال کر چلنا، یہ سب وہ مظاہر ہیں جو بے خدا قوموں کی اجتماعی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں دیکھ کر ذہن شدید الجھن سے دوچار ہو

---

[1] رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے حالیہ اجلاس میں صالح اوزجان نے بتایا کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ انہوں نے اس کا ایک نسخہ بھی مولانا محترم کو پیش کیا۔

جاتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر استنبول اور انقرہ پر اسی تہذیب کا غلبہ رہا تو ترکی صحیح اسلامی تہذیب کا گہوارہ کیسے بن سکے گا اور اسلامی تہذیب کو بحال کرنے کے لیے اُسے کتنے شدید کام اور طویل محنت کی ضرورت ہو گی۔ جو عورتیں صحیح معنوں میں مسلمان ہیں وہ گھروں سے ہی نہیں نکلتیں، اور گھروں سے نکل کر بازاروں اور دفتروں اور محفلوں میں آکر رونق پیدا کرنے والی عورتیں یا تو مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ یہودی ہیں یا ارمن، عیسائی ہیں یا دونمہ۔ اور اگر مسلمان ہیں تو ان خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں جنہوں نے دنیا کی ہر بُری بھلی چیز کو اہمیت دی ہے مگر اسلام کو اہمیت نہیں دی۔

البتہ ایک پہلو اِس تاثر کا یہ بھی ہے کہ عید یا کسی دوسرے تہوار کے جھگڑوں پر لاہور اور کراچی میں پاکستانی نوجوان جس غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ انقرہ جیسے مغرب پرست شہر میں نہیں نظر آتے۔ ترک نوجوانوں کے لباس میں ٹیڈیوں کا چھچھورپن نہیں ہے۔ ہے تو سُوٹ مگر باوقار ہے۔ چہروں سے شرارت نہیں ٹپکتی بلکہ متانت اُجاگر ہے۔ لبنانیوں اور شامیوں کی طرح ترفّع اور خود پسندی نہیں پائی جاتی بلکہ تواضع اور محبت پائی جاتی ہے۔ نفاستِ ذوق، محبت اور اخلاص ان کے قومی خصائل ہیں۔

افطاری حسبِ وعدہ شیخ نشار کے ہاں کی۔ افطاری اور نماز کے بعد کھانا کھا رہے تھے کہ شیخ نشار نے بتایا کہ یہ آخری روزہ ہے۔ کل کو عید ہو گی۔ خاکسار نے دریافت کیا کہ کیا چاند ہو گیا ہے۔ شیخ نشار نے بتایا کہ ترکی میں عید چاند دیکھنے پر نہیں ہوتی بلکہ فلکی حساب کے تحت ہوتی ہے۔ ہمیں پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ فلاں روز عید ہو گی اور ہمارا یہ فلکی حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ شیخ نشار کا دسترخوان نہایت پُرتکلف اور وسیع و عریض تھا۔ خصوصاً ترکی پلاؤ میں چیزوں کی بہتات خوب تھی۔ اور بھی متعدد چیزیں ایسی تھیں جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مگر خاکسار بالآخر اسی نتیجے پر پہنچا کہ پاکستان کے دسترخوان کا مقابلہ مشکل ہے۔ کھانا لانے کی خدمت شیخ نشار کی ایک صاحبزادی سرانجام دیتی رہی جس نے مکمل ساتر لباس پہن رکھا تھا۔ صرف چہرہ اور ہاتھ کھلے تھے۔ کھانے کے بعد اطمینان سے مجلس جم گئی۔ اب تراویح کی مشغولیت باقی نہ رہی تھی۔

ترک حاجیوں کے لیے سرکاری انتظامات باتیں تو ہشت پہلو تھیں۔ ترکی حاجیوں کا قصہ چھڑا تو شیخ نشار نے بتایا اب حکومت ہر سال حج کی سہولتوں میں اضافہ کرتی جا رہی ہے۔ اور جتنے لوگ حج کے لیے جانا چاہیں جائیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی حجاج کی تعداد تمام دنیا کے حاجیوں سے زیادہ ہوتی ہے[1]۔ شیخ

---

[1] ترکی حاجیوں کی تعداد چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان ہوتی ہے۔ ترکی کی مجموعی آبادی ۴ کروڑ سے کم ہے یعنی پاکستان کی تہائی آبادی سے کچھ زیادہ۔

یشار نے بتایا کہ ہر حاجی پر پابندی ہے کہ وہ دو سو ڈالر کا انتظام کرے۔ کم از کم دس رومال اور دس جرابیں اس کے پاس ہوں تاکہ صاف ستھرے لباس کا مظاہرہ ہو۔ حج فلائٹوں میں یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ ائیر ہوسٹس اسکرٹ نہ پہنیں بلکہ ٹخنوں تک پورا لباس پہنیں۔ ان کے صرف چہرے اور ہاتھ کھلے ہوں۔ ہر فلائٹ میں حکومت کی طرف سے ایک مفتی کا انتظام ہوگا جو حاجیوں کو موقع و محل کی مناسبت سے حج کے مسائل سے آگاہ کرے گا۔[1] شیخ یشار نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس مرتبہ شام کی حکومت خشکی کے راستے سے ترکی حاجیوں کو گزرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہے۔ اگر حاجیوں کی بسیں شام سے گزر کر جائیں تو انہیں صرف دو ہزار کیلو میٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے مگر اب یہ بسیں عراق اور کویت سے ہو کر سعودی عرب میں داخل ہوں گی۔ اور انہیں سات ہزار کیلو میٹر کا سفر کرنا پڑے گا۔

قُبرُص کی حالت | عالمِ اسلامی کے مسائل کا ذکر چھڑا تو میں نے قُبرُص کے بارے میں شیخ یشار سے بعض سوالات کر دیئے۔ ترکی کے لیے قُبرُص کا مسئلہ وہی اہمیت و نزاکت رکھتا ہے جو پاکستان کے لیے کشمیر کو حاصل ہے۔ قُبرُص کی سیاسی صورتِ حال سے تو پاکستان کے مسلمان ناواقف نہیں ہیں۔ قُبرُصی ترکوں اور قُبرُصی یونانیوں کی باہمی کشیدگی اور قُبرُصی یونانیوں کے ترک آبادی پر مظالم کی داستان کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ یہ جزیرہ طویل مدت تک عثمانی خلافت کے تحت رہ چکا ہے۔ اِس صدی کے اوائل تک اس میں اسلامی تعلیم کا بڑا چرچا تھا۔ مگر جب سے انگریزوں نے قبرص میں قدم رکھا وہاں کا مسلمان بھی انگریزی تہذیب کا شکار ہوتا چلا گیا۔ شیخ یشار نے بتایا کہ ہم قبرصی ترکوں کے لیے آخر دم تک لڑیں گے۔ مگر جہاں تک قبرص کے ترک مسلمانوں کا حال ہے وہ اسلام سے بہت دُور ہو چکے ہیں۔ بگاڑ ان کے اندر وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے۔ اسلامی شعائر اور نماز و روزہ کا وہاں نام و نشان نہیں ہے۔ اِس مرتبہ رمضان المبارک کے آغاز پر ہم نے چار واعظ بھیجے۔ دو اس بنا پر واپس آگئے کہ انہوں نے جب اسلامی اخلاق اور اسلامی احکام کی تبلیغ شروع کی تو لوگوں نے اسے ناپسند کیا، اور اِن باتوں کو سننے سے انکار کر دیا۔ باقی دو بھی وہاں سے مسلسل خطوط لکھ رہے ہیں کہ ہماری تبلیغ سے لوگ ناخوش ہیں۔ اور مغربی تہذیب پر کسی قسم کی تنقید انہیں اچھی نہیں لگتی۔ بلکہ شیخ یشار نے رازدارانہ طور پر کہا کہ مفتی قُبرُص کا حال بھی بہت پتلا ہے۔ ان کے گھر کی تمام خواتین مغربی عورتوں کا لباس پہنتی ہیں۔ شیخ کہنے لگے کہ ایک طرف جنگی نقطۂ نظر سے قُبرُص کی اہمیت کو دیکھیں اور دوسری طرف وہاں کے مسلمانوں کی یہ غفلت دیکھیں کہ انہیں اپنے قومی

---

[1] اِس مرتبہ ترکی حکومت نے ان انتظامات کو مزید ترقی دے دی ہے۔

تشخص کا احساس تک نہیں ہے۔ شیخ لیشار سے معلوم ہوا کہ قبرص کے ترک بہت بڑی تعداد میں روزگار کے لیے لندن اور جرمنی جا رہے ہیں۔ صرف لندن میں ۴۰ ہزار کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ جہاں تک قبرص کے مسئلے کا تعلق ہے ہم سو فیصد وہی احساس رکھتے ہیں جو ہمارے ترک بھائیوں کے ہیں مگر شیخ لیشار سے وہاں کے اخلاقی بگاڑ اور دینی کمزوری کا حال معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا۔ قبرص کے عیسائی صدر میکاریوس کو دنیا بھر کے صلیب پرستوں کی حمایت حاصل ہے۔ مگر قبرص کے مسلمان کے لیے صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی کا سہارا ہے۔ اگر وہ اس سہارے کو بھی چھوڑ دیں تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہو گی۔ اگر اُن تمام مسلمان قوموں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے جو ظالم اور کافر طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار رہیں تو یقیناً یہ مشترک نتیجہ برآمد ہو گا کہ یہ قومیں اخلاقی اور مذہبی ضعف میں مبتلا ہیں اور ان کے ابتلاء کے اسباب میں سے اہم سبب انہی دونوں پہلوؤں میں غیر معمولی کوتاہی ہے۔

میں نے شیخ لیشار سے آخری سوال یہ کیا کہ آپ کے محکمۂ امور مذہبی کی سرگرمیوں کی تفصیل کیا ہے۔ نیز ترکی میں دینی تعلیم کے احیاء کا کام کس حد تک ہو رہا ہے۔ موصوف نے کہا اگر مختصر جواب درکار ہے تو میں ابھی بتائے دیتا ہوں اور اگر جملہ تفصیل پیشِ نظر ہے تو پھر ایک روز میرے دفتر میں آ جائیں، میں تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال دوں گا۔ میں نے موخر الذکر صورت کو ترجیح دی۔ اور ایک طویل سوالنامہ تیار کرنے کی اسکیم سوچ لی۔ چنانچہ شیخ لیشار سے ہم نے اجازت لی، اور خاکسار برلن ہوٹل کی طرف اور صالح اوزجان اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔

نمازِ عید | عید کی پوری رات ریڈیو سے قرآن پاک کی تلاوت اور مذہبی تقریریں ہوتی رہیں۔ ترکی انداز کی دلچسپ نعتیں اور قصیدے بھی سنائے جاتے رہے۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی توپیں چلنی شروع ہو گئیں۔ گنتی تو یاد نہیں ہے لیکن دس گیارہ سے کم نہیں تھیں۔ یہ اس امر کا سرکاری طور پر اعلان تھا کہ آج انقرہ عید منا رہا ہے۔ جامع بیرم برلن ہوٹل سے کافی دُور ہے۔ اس لیے میں نے نماز فجر ہوٹل ہی میں ادا کی۔ اور پاکستانی رواج کے مطابق خیال کیا کہ سُورج طلوع ہو جانے پر عید گاہ کی طرف نکل پڑوں گا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد کپڑے تبدیل کیے، چائے پی اور جامع بیرم کی طرف چل پڑا۔ قیاس تھا کہ لوگ کثرت کے ساتھ ہاتھوں میں جانماز لیے عید گاہ کی طرف جا رہے ہوں گے اور یہ اس امر کی علامت ہو گی کہ کچھ وقفے کے بعد نماز عید کھڑی ہو جائے گی۔ مگر عید گاہ کی طرف جانے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ترک دیر سے نماز عید پڑھتے ہیں۔ مجھے اب عجلت

کی حاجت نہ تھی۔ مگر خراماں خراماں جب جامع بیرم کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ مسجد کا بیرونی صحن بھی پوری طرح بھر رہا ہے اور اب لوگ مسجد سے باہر اپنے لیے جگہ بنا کر بیٹھ رہے ہیں۔ اور لاؤڈ اسپیکر سے قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے۔ سردی سخت تھی، اتنی سخت کہ دماغ چکرانے لگا۔ جانماز اس لیے ساتھ نہ لی کہ چونکہ جلدی میں نکل رہا ہوں اس لیے مسجد کے اندر صف اول میں جگہ ملے گی۔ مگر اب نماز کھلے صحن میں پڑھنا ہوگی اور وہ بھی کیونکر۔ ترک آرہے تھے۔ عام لوگ ہاتھوں میں جانماز لیے آتے اور بچھا کر بیٹھ جاتے۔ اور جس کے پاس جانماز نہ ہوتی وہ اوور کوٹ اتار کر اُسے بچھا لیتا۔ میں کیا کروں۔ "اتحاد" اخبار بک رہا تھا اُسے جانماز کی نیت سے خریدا اور بچھا لیا۔ مگر سخت تکلیف اور پریشانی۔ ایک ترک نے مجھے یوں مبہوت دیکھ کر اپنے پاس بُلا لیا۔ اور اپنے گرم کمبل پر مجھے بٹھا لیا۔ فوج کا ایک باوردی دستہ آیا۔ اُن میں سے کسی کے پاس کوئی جانماز یا کمبل نہ تھا۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنا بھاری بھرکم فوجی کوٹ اتارا اور اُسے بلا تکلف بچھا لیا۔ صحت مند اور سردی کے عادی ترکوں کے لیے یوں کر لینا معمولی بات ہے۔ مگر اپنے تو کوٹ کے باوجود دانت بج رہے تھے۔ خطیب صاحب نے ۲۰ منٹ تک تقریر کی۔ معلوم نہیں کیا بات وہ کہتے رہے۔ مگر فلسطین اور پاکستان اور اسلام اور جہاد اور شریعت اور حق و باطل کے کلمات بار بار استعمال کیے۔ یہ وہی خطیب ہیں جن کا ذکر میں پیچھے کر چکا ہوں۔ تقریر کے بعد نماز کھڑی ہوئی اور خطبۂ عید پڑھا گیا۔ اور لوگ ایک دوسرے سے "بیرم مبارک" (عید مبارک) کہتے اور مصافحہ اور تقبیل سے اظہارِ محبت کرتے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اور میں رُک گیا کہ خطیب سے بیرم مبارک کرتا جاؤں۔

حافظ ذکائی خطیب مسجد سے معلوم ہوا کہ عید کے روز لوگ نمازِ فجر کے وقت ہی مسجد میں آنے شروع ہو جاتے ہیں اور اُس وقت تک قرآن مجید کی تلاوت اور دعا و ذکر میں مشغول رہتے ہیں جب تک عید سے فارغ نہیں ہو جاتے۔ مسجد کے اندر کا کشادہ و طویل صحن نمازِ فجر کے وقت ہی پُر ہو گیا تھا۔ البتہ باہر کی زائد صفوں کے لوگ بعد میں آئے ہیں۔ ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔ جامع بیرم چونکہ انقرہ کی قدیم ترین مسجد ہے اس لیے لوگوں کا اکثر و بیشتر رجوع اسی مسجد کی طرف رہتا ہے۔ نماز کے معاملے میں ترکوں کا اہتمام ہر بات سے عیاں ہے۔ حاضرین میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ ایک اور بات دیکھ کر طبیعت کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ ہے گداگروں کی کمی۔ صرف چار یا پانچ گداگر نظر آئے۔ ورنہ جتنا بڑا یہ مذہبی اجتماع تھا پاکستان کے تناسب کے مطابق یہاں سینکڑوں گداگر ہونے چاہییں تھے۔ مگر پورے ترکی میں گداگری کم ہے۔ ترک محنت کو گداگری پر ترجیح دیتا ہے۔ اور جو گداگر ہے وہ یقیناً مستحق ہے۔ مجھے اس موقع پر قاہرہ یاد آیا۔ قاہرہ گداگروں

سے بھرا ہوا ہے۔ اچھا بھلا تنومند آدمی آپ کے پاس ہاتھ پھیلا کر کہے گا اللہ یو دیك المطلوب یا عمی (چچا، اللہ تیری مراد پوری کرے گا)، کچھ عنایت ہو۔ اور اگر آپ نے "اللہ کریم" اور "اللہ یُعطیک" کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی تو وہ آپ کے کپڑوں کو ہاتھ لگا لگا کر الحاح جاری رکھے گا۔ اس کی وجہ غربت بھی ہو سکتی ہے اور پیشہ ورانہ عادت بھی۔ نماز کے بعد ترکی کا اسلامی ہفت روزہ "اتحاد" بکثرت بکا۔ بلکہ ایک صاحب نے اتحاد کا ایک پورا انبار خرید لیا اور بیچنے والے لڑکے سے کہا کہ اسے لوگوں میں مفت تقسیم کرتے جاؤ۔ اتحاد کا یہ عید نمبر تھا اور اس میں کئی اسلامی مضامین درج تھے۔

عید ملاپ | عید ملاپ کا طریقہ تمام اسلامی ممالک میں تقریباً یکساں ہے۔ عرب ممالک میں عید ملنے کا رواج یہ ہے کہ ایک دوسرے کو "من العائدین" (خدا کرے کہ آپ کی یہ عید بار بار نصیب ہو) یا "کل عام وانتم بخیر" (آپ کا ہر سال خیر و عافیت سے گزرے) کہیں گے۔ پاکستان اور ہندوستان میں مصافحہ اور معانقہ کا رواج ہے۔ ترکی میں مصافحہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی "بیرم مبارک" کہتے ہیں۔ جو شخص عید ملنے کے لیے آئے گا وہ بیرم مبارک اور علیک سلیک کے بعد محفل میں بیٹھ جائے گا۔ مٹھائی اور قہوہ اُسے پیش کیا جائے گا۔ اور جب واپس جانے لگے گا تو صاحب خانہ کے رخسانہ کو بوسہ دے گا۔ سعودی عرب میں صاحب خانہ کی طرف سے رخصت ہونے والوں کے ہاتھوں پر خوشبو بھی لگائی جاتی ہے۔ صالح اوزجان صاحب ہوٹل میں آگئے اور مجھے ساتھ لے لیا تاکہ دوستوں سے عید ملنے کے لیے جائیں۔ میں نے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا۔ لوگوں سے ملاقات بھی ہو گی۔ ترکی رسوم کا مشاہدہ بھی ہو گا اور حالات و نظریات کی جھلک بھی ملے گی۔ سب سے پہلے سعودی سفیر کے ہاں گئے۔ سعودی سفیر کے ہاں جا کر بیٹھے ہی تھے کہ دو عرب خواتین بھی ملنے کے لیے آگئیں۔ سفیر صاحب اور تمام دوسرے حضرات کے ساتھ انہوں نے مصافحہ کیا۔ صالح اوزجان اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ خواتین کو غالباً اور حاضرین کو بھی شاید ہماری یہ "رجعت پسندانہ" حرکت ناگوار گزری۔ سفیر صاحب نے خندۂ استہزاء کے ساتھ اس کی فوری توجیہ یہ کر دی کہ "ہم دونوں شافعی ہیں" اس لیے اضطراراً عورتوں سے ہاتھ نہیں ملا رہے۔ صالح اوزجان نے بعد میں مجھ سے پوچھا کہ کیا تم اس توجیہ کا مطلب سمجھ گئے تھے؛ اور پھر خود ہی بتانے لگے کہ شافعی مسلک کے مطابق اگر کوئی باوضو شخص عورت کو چھوئے تو اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی مسلک کا سہارا لیتے ہوئے سفیر صاحب نے حاضرین کو یہ تاثر دیا ہے کہ چونکہ ہم وضو سے ہیں، اور مسلکاً شافعی ہیں اس لیے وضو ٹوٹ جانے کے خطرے کی بنا پر عورتوں سے مصافحہ نہیں کر سکے۔" میں نے کہا کیا حنفی یا حنبلی

مسلک میں غیر عورت سے ہاتھ ملانا جائز ہے؟ جدید تہذیب نے مسلمانوں کو جن روگوں میں مبتلا کر دیا ہے اُن سے قدم قدم پر سامنا ہوتا ہے۔ کبھیں انسان زچ نکلتا ہے اور کبھیں ملوث ہو جاتا ہے۔ عید کے روز یہی دُعا دل و زبان پر رہی کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک کے روزوں کو قبولیت و اجر سے نوازے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کروائے جو کیے کرائے پر پانی پھیر دے۔

ترکی کی کسان پارٹی کے نائب صدر اسماعیل حقی بھی سعودی سفیر سے عید ملنے کے لیے آئے۔ عدالت پارٹی میں شامل تھے۔ مگر اب قوم پرستوں سے مل گئے ہیں۔ ترکی زبان میں اپنی نئی تصنیف انہوں نے سفیر صاحب کو پیش کی۔ اس کتاب میں انہوں نے بتایا ہے کہ یہودیوں نے کس طرح ترکی کو نقصان پہنچایا ہے۔ فری میسن اور دیگر یہود نواز اداروں پر کتاب میں مفصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ صالح اوزجان اسماعیل حقی کی گفتگو کا عربی ترجمہ کرتے رہے۔ اسی مناسبت سے ترکی کی تاریخ حاضر پر گفتگو چل نکلی۔ سفیر صاحب نے ایک نہایت پتے کی بات کہی وہ یہ کہ ترکوں کے مقابلے میں ہم نے انگریزوں سے مدد حاصل کی اور نتیجۃً ہم انگریزی استعمار کے غلام ہو کر رہ گئے۔ اب پھر ہم اپنے داخلی مسائل حل کرنے کے لیے روس کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ روسی سامراج مسلط ہو گیا تو اُس سے نجات پانے کے لیے کتنی مدت درکار ہو گی۔

سعودی سفیر کے ہاں سے فارغ ہو کر انڈونیشی سفیر صاحب کے ہاں آگئے۔ انڈونیشی سفیر بہت پکے مسلمان ہیں۔ بڑی بے تکلفی اور محبت سے ملے۔ مجھے بتانے لگے کہ جکارتا میں میرا گھر ہے۔ وہاں میرے پاس مولانا مودودی کی تمام عربی تصانیف موجود ہیں۔ میں نے انہیں بار بار پڑھا ہے۔ یہاں انقرہ میں بھی اُن کے پاس مولانا محترم کی عربی کتابوں کا ایک سیٹ موجود ہے۔ بڑے برادرانہ انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ اور بار بار مولانا محترم سے عقیدت و محبت کا اظہار کرتے رہے۔ مجھے تاکید کی کہ میں ہر نئی عربی کتاب سے انہیں مطلع کر دیا کروں۔ خریدنے کا انتظام وہ خود کریں گے۔ عیسائیت اور قادیانیت کے رد میں انہیں لٹریچر کی شدید ضرورت ہے۔ عربی میں ہو یا پھر بدرجۂ آخر انگریزی میں۔ عید کی چہل پہل پر انڈونیشی سفیر بھی بڑے خوش تھے۔ بتانے لگے کہ ترکی کا نوجوان طبقہ نماز کی طرف خوب مائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے محلہ سفراء کی مسجد میں نماز پڑھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ الٹرا ماڈرن لوگوں کا محلہ ہے۔ مگر حاضری پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ دُور دُور تک سڑکیں رُک گئیں۔ سفیر صاحب کے بیان کے مطابق ان حاضرین

ہیں ۷۰ فیصد نوجوان تھے۔ مولانا محترم کے دَورۂ ترکی کے منتظر ہیں۔ اس بارے میں انہوں نے بعض تجاویز بھی مجھے نوٹ کروائیں۔ انڈونیشی سفیر کے ہاں سے نکل کر تونسی سفیر کا رُخ کیا۔ ان کا نام احمد بن عرفہ ہے۔ تونس کے مشہور امام و محدّث ابن عرفہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ اپنی گفتگو میں اجتہاد اور روشن خیالی پر زور دیتے رہے۔ تونس اس وقت جس قدر "روشن خیال" ہو چکا ہے اُس کے بعد اب معلوم نہیں مزید کتنی روشن خیالی درکار ہے۔ صالح اوزجان صاحب حال ہی میں تونس کا دَورہ کر کے آتے ہیں اور تونس کی بے حیائی اور اخلاقی انحطاط کا ذکر کرتے وقت کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ یہ سب اُسی روشن خیالی اور اجتہاد کی برکت ہے جسکی مزید ضرورت کا اظہار سفیر صاحب نے کیا۔ سفیر صاحب خود ہی کہنے لگے کہ مَیں نے اسلام کا بنیادی مطالعہ نہیں کیا ہے۔ میرے لیے ایسی کتابیں تجویز کی جائیں جو اسلام کو سمجھنے میں مدد دیں۔ ان ملاقاتوں کے اصل خواہشمند صالح اوزجان تھے۔ مَیں تو صرف عید گزارنے کے لیے ان کے ساتھ منسلک تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے اگریکلچرل انجینئر استاد احمد کے ہاں کھایا۔ موصوف نے بتایا کہ وہ ترکی کو چھوڑ کر مکۃ معظمہ جانا چاہتے ہیں۔ وہاں اپنی ملازمت کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ مَیں نے عرض کیا کہ ترکی میں حق اور باطل کی جو کشمکش برپا ہے اُسے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں ہے۔ بتانے لگے میری بچیاں جوان ہو رہی ہیں، موجودہ ماحول کے اندر ان کی اسلامی تربیت نہیں کی جا سکتی۔

عید کے بعد برلن ہوٹل چھوڑ کر صالح اوزجان صاحب کے مکان پر منتقل ہو گیا جو انقرہ سے ۱۵-۲۰ میل دُور سنجان نامی آبادی میں واقع ہے اور ان کا دفتر اور مکتبہ انقرہ میں ہے۔ بڑے درویش آدمی ہیں۔ ان کا مکان بھی نہایت تنگ اور سادہ سا ہے۔ بارشوں کی وجہ سے راستہ کیچڑ سے اٹا ہوا اور خاصا دشوار گزار۔ بس سے اُتر کر جب گھر کے قریب پہنچے تو صالح اوزجان نے میرا سامان باصرار اپنے سر پر اٹھا لیا۔ ان کی یہ محبّت اور درویش منشی کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ ڈاکٹر ہیں۔ ماہنامہ ہلال کے ایڈیٹر ہیں۔ ایک اچھے اسلامی مکتبے کے مالک ہیں۔ طب کا پیشہ کرتے تھے مگر اسلامی تحریک کی ضرورت کے پیشِ نظر پریکٹس چھوڑ دی اور اب شبانہ روز تحریک کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ جفاکشی اور تیز روی کے پیکر ہیں۔ مولانا محترم کو اپنا استاذ اور مرشد کہتے ہیں۔

ترکی میں مولانا مودودی کی کتابوں کی اشاعت شبِ سنجان بڑی مفید ثابت ہوئی۔ صالح اوزجان کے بچّے گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اب میں تھا اور صالح اوزجان۔ برف آمیز رات نے اپنے تاریک سائے پھیلا دیے۔

سُرخ ٹھیریل کے جو کور چھوٹے چھوٹے مکانات پر سناٹا چھا گیا۔ باہر جھانک کر دیکھا تو پُوری آبادی بحرِ ظلمات میں غرق پائی۔ کہیں اِکّا دُکّا کسی روشندان سے بجلی کی روشنی جھلکتی۔ صالح اوزجان نے اپنے ہاتھ سے "امام بایلدی" (ایک ترکی کھانا) تیار کیا اور ہم دونوں نے مل کر کھایا۔ نماز عشا کے بعد مَیں نے صالح اوزجان سے ایک سوال کر دیا جس کا جواب وہ آدھی رات تک دیتے رہے۔ میرا سوال یہ تھا کہ آج تک آپ نے ہماری کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور ان کی رفتارِ اشاعت کیا ہے؟ صالح صاحب نے جواب کا آغاز اس تمہید سے کیا کہ تمہیں معلوم ہے، مَیں نے مولانا مودودی کی کتابوں کے ترکی ترجمے اور اُن کی طباعت کا کام اُن حالات میں شروع کیا تھا جب یہاں کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ کوئی اسلامی کتاب چھاپے۔ آج سے ۱۲ سال قبل تک ترکی پر وہ ہولناک فضا طاری تھی جو مصطفیٰ کمال کے عہد سے چلی آرہی تھی۔ عدنان مندریس نے پہلی مرتبہ مذہب کو تھوڑی بہت آزادی دی اور ہم لوگوں نے اپنے کام کی داغ بیل ڈالی۔ مگر اس کے باوجود کسی ایسی کتاب کو چھاپنا جو اسلام کے سیاسی اور دستوری نظام سے بحث کرے محال تھا۔ اور اگر ایسی کتاب چھاپ دی جاتی تو ناشر کو خطرہ رہتا تھا کہ وہ ضبط کر لی جائے گی اور ناشر جیل کی ہوا کھائے گا۔ ۱۹۵۶ء میں ہم نے پہلی مرتبہ مولانا محترم کا ایک چھوٹا سا رسالہ "کلمہ طیبہ کے معنی"[1] دس ہزار چھاپا۔ اس کے بعد لوگوں کی طرف سے اس مصنّف کی مزید تحریروں کی مانگ پیدا ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ہم نے "دینِ حق" نامی پمفلٹ ۵ ہزار شائع کیا۔ دینِ حق کی اشاعت سے ہمارے حوصلوں میں بے حد اضافہ ہُوا کیونکہ اسے پڑھے لکھے طبقے نے بڑا پسند کیا اور سرگوشیوں کے انداز میں جا بجا محفلوں میں ہمیں مبارک باد دی گئی۔ ہمارے پاس وسائل بہت کم تھے۔ میں تنہا اپنی جیب سے جو کچھ بنتا خرچ کرتا تھا۔ اسی زمانے میں مَیں نے اپنا ماہنامہ "اسلام" جاری کر لیا تھا۔ موجودہ ماہنامہ "ہلال" اسی کا جانشین ہے۔ اپنے ماہنامے میں مَیں نے بعض مضامین شائع کیے جنہیں بعد میں کتابی صورت میں چھاپا گیا۔ مجھ پر بارہا ان کتابوں کے چھاپنے پر مقدمات دائر ہوئے مگر الحمدللہ ہم ان مقدمات میں کامیاب ہوتے رہے۔ ۱۹۶۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کا زمانہ ہم پر دوبارہ سختیوں کا پیغام لے کر آگیا اور ہماری فکری تحریک کی رفتار ماند پڑ گئی۔ اب دوبارہ ہماری کوششیں بحال ہو رہی ہیں اور ہم تہیّہ کر چکے ہیں کہ ترکی میں اسلامی فکر میں جو کمزوری پائی جاتی ہے اُسے دُور کریں۔ ترکی ان دنوں سخت دھچکوں سے دوچار ہے مگر ہمیں یا یں ہمہ اپنے کارواں کو آگے نکالنے کے لیے ہر طرح کی بازی لگانی ہے۔

---

[1] خطبات کی ایک تقریر۔

صالح اوزجان جب بات کرتے ہیں تو ان کا چہرہ اُن کے اندرونی تلاطم کی مکمل غمازی کرتا رہتا ہے۔ بالعموم وہ ہنس ہنس کر بات کرتے ہیں۔ ان کی پیشانی پر ہمیشہ خندہ روئی بکھری رہتی ہے۔ اپنے بارہ سالہ کام کی روداد سناتے وقت بے انتہا خوشی کا اظہار کرتے جاتے تھے۔ اس بات کی خوشی کہ موجوں کی ہزار کشاکش کے باوجود وہ سفینۂ دعوت کو آگے ہی بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک ہماری جو کتابیں شائع کی ہیں، ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔ کلمہ طیبہ کے معنی۔ دو اڈیشن۔ ہر اڈیشن دس ہزار

۲۔ دینِ حق

۳۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟

۴۔ سُود

۵۔ اسلامی تحریک کی اخلاقی بنیادیں

۶۔ اسلام کا نظامِ حیات

۷۔ اسلام کا اقتصادی نظام

۸۔ اسلام کا سیاسی نظام

۹۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

۱۰۔ رسالۂ دینیات

۱۱۔ تجدید و احیائے دین

۱۲۔ اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی

یہ تو وہ کتابیں ہیں جو صالح اوزجان نے خود شائع کی ہیں۔ مگر انہوں نے یہ بھی بتایا کہ جب ہماری جدوجہد سے مولانا محترم کی کتابوں کی خوب مانگ پیدا ہو گئی اور ہم نے اپنا راستہ لڑ بھڑ کر ہموار کر لیا تو دوسرے کاروباری لوگوں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور ہماری اجازت کے بغیر متعدد کتابیں شائع کر دیں مثلاً ضبطِ ولادت، اسلام اور جدید معاشی نظریات اور الجہاد فی سبیل اللہ دوسرے مکتبوں کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔ صالح اوزجان اس بات پر مُصر تھے کہ میرے سوا یہاں کسی کو مولانا محترم کی کتابیں چھاپنے کی اجازت نہ ہونی چاہیے۔ میں دعوت کے نقطۂ نظر سے یہ کام کرتا ہوں اور دوسرے کاروباری ذہن کے

ساتھ۔ صالح صاحب نے بتایا کہ خلافت و ملوکیت کا ترجمہ ہو چکا ہے، نظر ثانی ہو رہی ہے۔ "پردہ" کا جھگڑا جاری ہے[1]۔ تنقیحات زیر ترجمہ ہے۔ تفہیم القرآن بالاقساط ماہنامہ ہلال میں شائع ہو رہی ہے۔

راقم الحروف نے چند فقروں میں جو داستان زینتِ قرطاس کر دی ہے، اس کی تفصیلات دلچسپ بھی ہیں، حیرت انگیز اور المناک بھی۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ صالح اوزجان ان کتابوں کی اشاعت کی وجہ سے مہینے میں کئی مرتبہ سیکورٹی پولیس کے دفتر اور عدالت میں طلب کیے جاتے ہیں[2]۔ مگر یہ وطن کے مجاہد۔ جیل جا چکے ہیں۔ شہر بدر ہو چکے ہیں۔ ہر طرح سے زچ کیے جا چکے ہیں۔ مگر وہ اس عزم کے مالک ہیں کہ ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

---

[1] اس جھگڑے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب یہ کتاب بھی صالح اوزجان ہی شائع کریں گے۔

[2] اب ان پر نیا مقدمہ یہ قائم ہو چکا ہے کہ انہوں نے ماہنامہ ہلال میں مولانا مودودی کا وہ مختصر سا پیغام چھاپ دیا تھا جو مولانا محترم نے قرآن مجید کے چودہ سو سالہ جشن منعقدہ راولپنڈی میں ڈاکٹر فضل الرحمن کو بھیجا تھا۔

مطبُوعات

اَلاِحیاء مُدیرِ اعلیٰ : چوہدری نذیر احمد خان ۔ مقامِ اشاعت : دفتر الاحیاء، اا ڈنگہ سنگھ بلڈنگ شاہراہ قائداعظم، لاہور ۔ پاکستان ۔ قیمت سالانہ دس روپے ۔ فی پرچہ ۳ روپے ۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے ایک پونڈ اور دس شلنگ یا ۵ ڈالر۔

زیرِ تبصرہ مجلہ اتحادِ عالمِ اسلامی کی علمبردار تنظیم فرینڈز آف دی مسلم ورلڈ کا سرکاری ترجمان ہے ۔ یہ دو حصّوں پر مشتمل ہے ۔ حصّہ انگریزی اور حصّہ عربی ۔ انگریزی حصّے میں ڈاکٹر ایس ۔ اے رحمان، چوہدری محمد علی، ایر مارشل اصغر خان، چوہدری نذیر احمد، میاں منظر بشیر اور چوہدری کرم الٰہی بدرنے دنیائے اسلام میں اتحاد کے موضوع پر مختلف زاویوں سے اظہارِ خیال کیا ہے ۔ حصّہ عربی میں مفتی سید امین الحسینی اور مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودی کے مضامین شامل ہیں جو اسی موضوع سے بحث کرتے ہیں ۔ پرچے کا انداز بڑا علمی اور سنجیدہ ہے ۔ اس سہ ماہی مجلّے کا اتحادِ عالمِ اسلامی کے مقدس مقصد کی تکمیل کے لیے اجراء، ہر لحاظ سے قابلِ قدر سعی ہے ۔

کتابت اور طباعت کا معیار عمدہ ہے ۔

علوم القرآن تالیف : جناب ڈاکٹر صبحی صالح صاحب ۔ لبنان ۔ ترجمہ : مولانا غلام احمد حریری ایم ۔ اے قیمت کاغذ سفید ۱۵ روپے ۔ نیوز پرنٹ دس روپے ۔ صفحات ۴۸۴ ۔ ناشر : ملک برادرز کارخانہ بازار لائل پور ۔

کتاب کے مصنف اور مترجم دونوں کسی تعارف کے محتاج نہیں ۔ انہی صفحات میں ان کی قابلِ قدر تصنیف علوم الحدیث کا تعارف پیش کیا جاچکا ہے ۔ زیرِ تبصرہ کتاب کا اسلوب اور انداز بالکل اس سے ملتا جلتا ہے ۔ فاضل مصنف نے قرآن حکیم کے بعض بنیادی حقائق، مثلاً حقیقتِ وحی، جمع و تدوینِ قرآن، علوم القرآن، ارتقاءِ تفسیر اور اعجاز القرآن کے بارے میں جدید طرز پر بڑی مستند معلومات فراہم کردی ہیں ۔ اس کتاب کا

ہمارے نزدیک سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ اسلوبِ نگارش اور اندازِ بیان اگرچہ بالکل نیا ہے مگر تجدد پسندی کی اس میں کوئی جھلک نظر نہیں آئی۔

دوسرے فاضل مصنف نے بعض حقائق کی وضاحت کرتے ہوئے مستشرقین کی علمی خیانت کی بھی نشاندہی کی ہے اور اس طرح ہماری نوجوان نسل کے بہت سے شکوک و شبہات کو دُور کیا ہے۔ یہ کتاب چونکہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے مزاج اور مسائل کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اس لیے اس میں زیادہ تر انہی مباحث کی وضاحت پر زور دیا گیا ہے جو ان کے ذہنوں میں اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ یہ کتاب ترتیب و تدوین اور مواد کی فراہمی کے اعتبار سے بڑی قابلِ قدر ہے اور قرآنی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ البتہ ایک کمی یہ ضرور محسوس ہوتی ہے کہ مصنف نے وحی کے بارے میں اُس شرح و بسط سے بحث نہیں کی جس کا یہ موضوع تقاضا کرتا ہے۔ اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ اس کی نوعیت کو پوری تفصیل سے بیان کیا جاتا اور بعض لوگ اسے پیغمبر کے داخلی تجربات کا جو عکس قرار دیتے ہیں ان کے رد میں مسکت دلائل دیئے جاتے۔

کتاب کا معیارِ کتابت و طباعت اچھا ہے۔ البتہ جلد بندی میں احتیاط سے کام نہیں لیا گیا اور اوراق آگے پیچھے لگ گئے ہیں، جنہیں پڑھتے وقت کافی دقت محسوس ہوتی ہے۔

برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء | تالیف: جناب محمد الیاس خارانی ایم۔ اے۔ شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان۔ کراچی۔ صفحات ۲۰۹۔ قیمت تین روپے۔

دنیا کی ہر قوم اپنے اجتماعی شعور کے لیے الگ بنیاد رکھتی ہے جس کی بنا پر اُس کا قومی وجود دوسری اقوام سے جداگانہ ہوتا ہے۔ اسلام کا انسانیت پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس نے رنگ، وطن اور نسل کے مادی اور اتفاقی رشتوں کو قومیت کی اساس بنانے کے بجائے اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان کو اس کی اساس قرار دیا ہے۔ کلمہ طیبہ کی مقناطیسی کشش نے مختلف رنگوں، مختلف نسلوں، مختلف ملکوں اور مختلف زبانیں بولنے والے سلیم الفطرت افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ روحانی رشتوں میں ایسا منسلک کر دیا کہ اُن کے درمیان کامل فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ اسلام کا یہ کارنامہ درحقیقت اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ انسانی زندگی کی اصل مادہ نہیں بلکہ روح ہے۔ اسلام کا یہ تصورِ قومیت پوری دُنیا کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے اور اس بنا پر دینِ حق کے دشمنوں نے اس تصور کو ہمیشہ نقصان پہنچانے کی کوشش

کی ہے اور مسلمانوں کو یہ باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا ہے کہ انہیں اپنی قومیت کی اس مستحکم بنیاد سے ہٹ کر کسی مادّی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنی چاہیے۔ اللہ کا یہ بڑا احسان ہے کہ مسلمانوں کے حسّاس اور ذی شعور طبقے نے ان کی مذموم کوششوں کو ہمیشہ ناکام بنایا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب کے فاضل مصنف بھی اسی طبقے کے ایک دردمند فرد معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی فاضلانہ تصنیف میں مسلم قومیت کی اس دینی اساس کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح برصغیر پاک و ہند میں اس اساس نے مسلمانوں کو ایک الگ قومی شعور عطا کر کے اُن کے اندر الگ وطن کے قیام کی تڑپ پیدا کی۔ پاکستان درحقیقت مسلمانوں کے اس قومی شعور کا مظہر ہے۔ کتاب کا اندازِ بیان سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے۔ کتابت اور طباعت کا معیار پسندیدہ ہے۔

فون نمبر : ۶۲۵۰۷ رجسٹرڈ ایل نمبر : ۵۳۴۰

اِسلام کا معاشی نظام

ہی حقیقی معاشی انصاف اور اجتماعی عدل کا ضامن ہے

اس کے تفصیلی مطالعہ کیلئے حسبِ ذیل کتب ملاحظہ کیجئے

	کتاب	مصنف	اعلیٰ ایڈیشن	سستا ایڈیشن
۱۔	اسلام اور جدید معاشی نظریات	سید ابو الاعلیٰ مودودی	۲/۵۰ روپے	۱/۷۵ روپیہ
۲۔	سُود	"	۸/- "	۵/- "
۳۔	مسئلہ ملکیت زمین	"	۲/۲۵ "	۱/۵۰ "
۴۔	انسان کا معاشی مسئلہ اور اسکا اسلامی حل	"		۵۰ پیسہ
۵۔	اسلام اور عدلِ اجتماعی	"		۴۰ "
۶۔	اسلامی نظمِ معیشت اور اسکے اصول و مقاصد	"		۲۵ "
۷۔	قرآن کی معاشی تعلیمات	"		۵۰ "
۸۔	اسلام کا نظریہ ملکیت (حصہ اول)	ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی	۸/۵۰ "	۴/۵۰ روپے
۹۔	" " " (حصہ دوم)	"	۷/۵۰ "	۴/۵۰ "
۱۰۔	شرکت و مضاربت کے شرعی اصول	"	۳/- "	۲/- "
۱۱۔	اسلام کا نظامِ محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)	امام ابو یوسفؒ، ترجمہ۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی	۱۲/۵۰ "	۸/۵۰ "
۱۲۔	اسلام میں عدلِ اجتماعی	سید قطب شہید، ترجمہ۔ ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی	۱۲/۵۰ "	۶/۵۰ "

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ

۱۳۔ای شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

۱۶۔بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ